QuranUrdu.com

تفہیم القرآن

الحَدِید

(۵۷)

QuranUrdu.com

الحَدِیْد

نام

آیت ۲۵ کے فقرے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ سے ماخوذ ہے۔

زمانۂ نُزُول

یہ بالاتفاق مدنی سورت ہے اور اس کے مضامین پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ غالباً یہ جنگِ اُحُد اور صلحِ حُدَیْبِیَہ کے درمیان کسی زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ وہی زمانہ تھا جب مدینے کی مختصر سی اسلامی ریاست کو ہر طرف سے کفّار نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور سخت بے سروسامانی کی حالت میں اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پُورے عرب کی طاقت کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اِس حالت میں اسلام کو اپنے پیروؤں سے صرف جانی قربانی ہی درکار نہ تھی بلکہ مالی قربانی بھی درکار تھی، اور اس سورت میں اِسی قربانی کے لیے پُرزور اپیل کی گئی ہے۔ اس قیاس کو آیت ۱۰ مزید تقویت پہنچاتی ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کی جماعت کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ فتح کے بعد جو لوگ اپنے مال خرچ کریں گے اور خدا کی راہ میں جنگ کریں گے، وہ اُن لوگوں کے برابر کبھی نہیں ہو سکتے جو فتح سے پہلے جان و مال کی قربانیاں دیں۔ اور اسی کی تائید حضرت اَنَسؓ کی وہ روایت کرتی ہے جسے ابنِ مَرْدُوْیَہ نے نقل کیا ہے۔ وہ آیت اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ کے متعلق فرماتے ہیں کہ نزولِ قرآن کے آغاز سے ۱۷ برس بعد اہلِ ایمان کو جھنجوڑنے والی یہ آیت نازل ہوئی۔ اس حساب سے اس کا زمانۂ نزول ۴ھ اور ۵ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔

موضوع اور مضمون

اس کا موضوع اِنفاق فی سبیل اللہ کی تلقین ہے۔ اسلام کی تاریخ کے اس نازک ترین دَور میں، جب کہ عرب کی جاہلیت سے اسلام کا فیصلہ کُن معرکہ برپا تھا، یہ سورت اِس غرض کے لیے نازل فرمائی گئی تھی کہ مسلمانوں کو خاص طور پر مالی قربانیوں کے لیے آمادہ کیا جائے اور یہ بات اُن کے ذہن نشین کرائی جائے کہ ایمان محض زبانی اقرار اور کچھ ظاہری اعمال کا نام نہیں ہے، بلکہ اللہ اور اس کے دین کے لیے مخلص ہونا اس کی اصل روح اور حقیقت ہے۔ جو شخص اِس رُوح سے خالی ہو اور خدا اور اس کے دین کے مقابلے میں اپنی جان و مال اور مفاد کو عزیز تر رکھے، اس کا اقرارِ ایمان کھوکھلا ہے جس کی کوئی قدر و قیمت خدا کے ہاں نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں، تاکہ سامعین کو اچھی طرح یہ احساس ہو جائے کہ کس عظیم ہستی کی طرف سے اُن کو مُخاطَب کیا جا رہا ہے۔ اس کے بعد حسبِ ذیل

QuranUrdu.com

مضامین سلسلہ وار ارشاد ہوئے ہیں:

—— ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی راہِ خدا میں مال صَرف کرنے سے پہلوتہی نہ کرے۔ ایسا کرنا صرف ایمان ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ حقیقت کے اعتبار سے بھی غلط ہے۔ کیونکہ یہ مال دراصل خدا ہی کا مال ہے جس پر تم کو خلیفہ کی حیثیت سے تصرّف کے اختیارات دیے گئے ہیں۔ کل یہی مال دوسروں کے پاس تھا، آج تمھارے پاس ہے، اور کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا۔ آخرِ کار اسے خدا ہی کے پاس رہ جانا ہے جو کائنات کی ہر چیز کا وارث ہے۔ تمھارے کام اِس مال کا کوئی حصّہ اگر آ سکتا ہے تو صرف وہ جسے تم اپنے زمانۂ تصرّف میں خدا کے کام پر لگا دو۔

—— خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینا اگرچہ ہر حال میں قابلِ قدر ہے، مگر اِن قربانیوں کی قدر و قیمت مواقع کی نزاکت کے لحاظ سے متعین ہوتی ہے۔ ایک موقع وہ ہوتا ہے جب کفر کی طاقت بڑی زبردست ہو اور ہر وقت یہ خطرہ ہو کہ کہیں اسلام اس کے مقابلے میں مغلوب نہ ہو جائے۔ دوسرا موقع وہ ہوتا ہے جب کفر و اسلام کی کشمکش میں اسلام کی طاقت کا پلڑا بھاری ہو جائے اور اہلِ ایمان کو دشمنانِ حق کے مقابلے میں فتح نصیب ہو رہی ہو۔ یہ دونوں حالتیں اپنی اہمیّت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہیں۔ اس لیے جو قربانیاں اِن مختلف حالتوں میں دی جائیں، وہ بھی اپنی قیمت میں برابر نہیں ہیں۔ جو لوگ اسلام کے ضعف کی حالت میں اُس کو سربلند کرنے کے لیے جانیں لڑائیں اور مال صرف کریں، اُن کے درجے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو اسلام کے غلبے کی حالت میں اُس کو مزید فروغ دینے کے لیے جان و مال قربان کریں۔

—— راہِ حق میں جو مال بھی صَرف کیا جائے، وہ اللہ کے ذمّے قرض ہے، اور اللہ اسے نہ صرف یہ کہ کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا، بلکہ اپنی طرف سے مزید اجر بھی عنایت فرمائے گا۔

—— آخرت میں نُور اُنھی اہلِ ایمان کو نصیب ہو گا جنھوں نے راہِ خدا میں اپنا مال خرچ کیا ہو۔ رہے وہ منافق جو دنیا میں اپنے ہی مفاد کو دیکھتے رہے اور جنھیں اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی کہ حق غالب ہوتا ہے یا باطل، وہ خواہ دنیا کی اِس زندگی میں مومنوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں، مگر آخرت میں ان کو مومنوں سے الگ کر دیا جائے گا، نُور سے وہ محروم ہوں گے اور ان کا حشر کافروں کے ساتھ ہو گا۔

—— مسلمانوں کو اُن اہلِ کتاب کی طرح نہ ہو جانا چاہیے جن کی عمریں دنیا پرستی میں بیت گئی ہیں اور جن کے دل زمانۂ دراز کی غفلتوں سے پتھر ہو گئے ہیں۔ وہ مومن ہی کیا جس کا دل خدا کے ذکر سے نہ پگھلے اور اس کے نازل کردہ حق کے آگے نہ جھکے۔

—— اللہ کے نزدیک صدّیق اور شہید صرف وہ اہلِ ایمان ہیں جو اپنا مال کسی جذبۂ ریا کے بغیر صدقِ دل سے اس کی راہ میں صرف کرتے ہیں۔

—— دنیا کی زندگی محض چند روز کی بہار اور ایک متاعِ غرور ہے۔ یہاں کا کھیل کود، یہاں کی دلچسپیاں،

QuranUrdu.com

یہاں کی آرایش و زیبایش، یہاں کی بڑائیوں پر فخر، اور یہاں کا دھن دولت، جس میں لوگ ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوششیں کرتے ہیں، سب کچھ ناپائدار ہے۔ اس کی مثال اُس کھیتی کی سی ہے جو پہلے سرسبز ہوتی ہے، پھر زرد پڑ جاتی ہے، اور آخر کار بُھس بن کر رہ جاتی ہے۔ پائدار زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے جہاں بڑے نتائج نکلنے والے ہیں۔ تمھیں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو یہ کوشش جنت کی طرف دوڑنے میں صَرف کرو۔

—— دنیا میں راحت اور مصیبت جو بھی آتی ہے، اللہ کے پہلے سے لکھے ہوئے فیصلے کے مطابق آتی ہے۔ مومن کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ مصیبت آئے تو ہمت نہ ہار بیٹھے، اور راحت آئے تو اِترا نہ جائے۔ یہ تو ایک منافق اور کافر کا کردار ہے کہ اللہ اس کو نعمت بخشے تو وہ اپنی جگہ پھُول جائے، فخر جتانے لگے، اور اُسی نعمت دینے والے خدا کے کام میں خرچ کرتے ہوئے خود بھی تنگ دلی دکھائے اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا مشورہ دے۔

—— اللہ نے اپنے رسول کھلی کھلی نشانیوں اور کتاب اور میزانِ عدل کے ساتھ بھیجے تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں، اور اس کے ساتھ لوہا بھی نازل کیا تاکہ حق قائم کرنے اور باطل کا سر نیچا کرنے کے لیے طاقت استعمال کی جائے۔ اس طرح اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اُس کے دین کی حمایت و نُصرت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں اور اس کی خاطر جان لڑا دیں۔ یہ مواقع اللہ نے تمھاری اپنی ہی ترقی و سرفرازی کے لیے پیدا کیے ہیں، ورنہ اللہ اپنے کام کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔

—— اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے انبیا آتے رہے، جن کی دعوت سے کچھ لوگ راہِ راست پر آئے اور اکثر فاسق بنے رہے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام آئے، جن کی تعلیم سے لوگوں میں بہت سی اخلاقی خوبیاں پیدا ہوئیں، مگر ان کی اُمّت نے رہبانیت کی بدعت اختیار کر لی۔ اب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا ہے۔ اُن پر جو لوگ ایمان لائیں گے اور خدا سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کریں گے، اللہ اُن کو اپنی رحمت کا دُہرا حصّہ دے گا اور انھیں وہ نُور بخشے گا جس سے دنیا کی زندگی میں وہ ہر ہر قدم پر ٹیڑھے راستوں کے درمیان سیدھی راہ صاف دیکھ کر چل سکیں گے۔ اہلِ کتاب چاہے اپنے آپ کو اللہ کے فضل کا ٹھیکے دار سمجھتے رہیں، مگر اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، اُسے اختیار ہے جسے چاہے اپنے فضل سے نواز دے۔

یہ ہے اُن مضامین کا خلاصہ جو اس سورت میں ایک ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان ہوئے ہیں۔

QuranUrdu.com

۲۹ آیاتہا

سُوْرَۃُ الْحَدِیْدِ مَدَنِیَّۃٌ

۴ رکوعاتہا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ ہُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ۝۱

اللہ کی تسبیح کی ہے ہر اُس چیز نے جو زمین اور آسمانوں میں ہے[1]، اور وہی زبردست دانا ہے[2]۔

۱ – یعنی ہمیشہ کائنات کی ہر چیز نے اِس حقیقت کا اظہار و اعلان کیا ہے کہ اُس کا خالق و پروردگار ہر عیب اور نقص اور کمزوری اور خطا اور برائی سے پاک ہے۔ اُس کی ذات پاک ہے، اس کی صفات پاک ہیں، اس کے افعال پاک ہیں، اور اس کے احکام بھی، خواہ وہ تکوینی احکام ہوں یا شرعی، سراسر پاک ہیں۔ یہاں سَبَّحَ صیغۂ ماضی استعمال کیا گیا ہے، اور بعض دوسرے مَقامات پر یُسَبِّحُ صیغۂ مُضارِع استعمال ہوا ہے، جس میں حال اور مستقبل دونوں کا مفہوم شامل ہے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہمیشہ اپنے خالق و رب کی پاکی بیان کرتا رہا ہے، آج بھی کر رہا ہے، اور ہمیشہ کرتا رہے گا۔

۲ – اصل الفاظ ہیں: ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ۔ لفظ ھُوَ کو پہلے لانے سے خود بخود حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے، یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ عزیز اور حکیم ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہی ایسی ہستی ہے جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ عزیز کے معنیٰ ہیں: ایسا زبردست اور قادر و قاہر جس کے فیصلے کو نافذ ہونے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جس کی مزاحمت کسی کے بس میں نہیں ہے، جس کی اطاعت ہر ایک کو کرنی ہی پڑتی ہے، خواہ کوئی چاہے یا نہ چاہے، جس کی نافرمانی کرنے والا اُس کی پکڑ سے کسی طرح بچ ہی نہیں سکتا۔ اور حکیم کے معنیٰ یہ ہیں کہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کی تخلیق، اس کی تدبیر، اس کی فرمانروائی، اس کے احکام، اس کی ہدایات، سب حکمت پر مبنی ہیں۔ اُس کے کسی کام میں نادانی اور حماقت و جہالت کا شائبہ تک نہیں ہے۔

اس مَقام پر ایک لطیف نکتہ اور بھی ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ قرآنِ کریم میں کم ہی مقامات ایسے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کی صفتِ عزیز کے ساتھ قوی، مُقتدِر، جبّار اور ذُوانتقام جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، جن سے محض اُس کے اقتدارِ مُطلَق کا اظہار ہوتا ہے، اور یہ صرف اُن مواقع پر ہوا ہے جہاں سلسلۂ کلام اِس بات کا متقاضی تھا کہ ظالموں اور نافرمانوں کو اللہ کی پکڑ سے ڈرایا جائے۔ اِس طرح کے چند مقامات کو چھوڑ کر باقی جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے عزیز کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، وہاں اس کے ساتھ حکیم، علیم، رحیم، غفور، وہّاب اور حمید میں سے کوئی لفظ ضرور لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی ہستی ایسی ہو جسے بے پناہ طاقت حاصل ہو مگر اس کے ساتھ وہ نادان ہو، جاہل ہو، بے رحم ہو، درگزر اور معاف کرنا جانتی ہی نہ ہو، بخیل ہو، اور بدسیرت ہو تو اس کے اقتدار کا نتیجہ ظلم کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی ظلم ہو رہا ہے، اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ جس شخص کو دوسروں پر بالاتری حاصل ہے، وہ یا تو اپنی طاقت کو نادانی اور جہالت کے ساتھ

QuranUrdu.com

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۚ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ

زمین اور آسمانوں کی سلطنت کا مالک وہی ہے، زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے، اور ہر چیز پر

استعمال کر رہا ہے، یا وہ بے رحم اور سنگدل ہے، یا بخیل اور تنگ دل ہے، یا بدخُو اور بدکردار ہے۔ طاقت کے ساتھ اِن بُری صفات کا اجتماع جہاں بھی ہو، وہاں کسی خیر کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کی صِفتِ عزیز کے ساتھ اس کے حکیم وعلیم اور رحیم وغفور اور حمید و وَہّاب ہونے کا ذکر لازماً کیا گیا ہے، تاکہ انسان یہ جان لے کہ جو خدا اِس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے، وہ ایک طرف تو ایسا کامل اقتدار رکھتا ہے کہ زمین سے لے کر آسمانوں تک کوئی اس کے فیصلوں کو نافذ ہونے سے روک نہیں سکتا، مگر دوسری طرف وہ حکیم بھی ہے، اس کا ہر فیصلہ سراسر دانائی پر مبنی ہوتا ہے۔ علیم بھی ہے، جو فیصلہ بھی کرتا ہے ٹھیک ٹھیک علم کے مطابق کرتا ہے۔ رحیم بھی ہے، اپنے بے پناہ اقتدار کو بے رحمی کے ساتھ استعمال نہیں کرتا۔ غفور بھی ہے، اپنے زیردستوں کے ساتھ خُردہ گیری کا نہیں بلکہ چشم پوشی و درگزر کا معاملہ کرتا ہے۔ وہّاب بھی ہے، اپنی رعیّت کے ساتھ بخیلی کا نہیں بلکہ بے انتہا فیّاضی کا برتاؤ کر رہا ہے۔ اور حمید بھی ہے، تمام قابلِ تعریف صفات وکمالات اس کی ذات میں جمع ہیں۔

قرآن کے اِس بیان کی پُوری اہمیّت وہ لوگ زیادہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جو حاکمیّت (sovereignty) کے مسئلے پر فلسفۂ سیاست اور فلسفۂ قانون کی بحثوں سے واقف ہیں۔ حاکمیّت نام ہی اِس چیز کا ہے کہ صاحبِ حاکمیّت غیرمحدود اقتدار کا مالک ہو، کوئی داخلی وخارجی طاقت اُس کے حکم اور فیصلے کو نفاذ سے روکنے، یا اُس کو بدلنے، یا اُس پر نظرِ ثانی کرنے والی نہ ہو، اور کسی کے لیے اُس کی اطاعت کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہو۔ اِس غیرمحدود اقتدار کا تصوّر کرتے ہی انسانی عقل لازماً یہ مطالبہ کرتی ہے کہ ایسا اقتدار جس کو بھی حاصل ہو، اسے بے عیب اور علم وحکمت میں کامل ہونا چاہیے۔ کیونکہ اگر اِس اقتدار کا حامل نادان، جاہل، بے رحم، اور بدخُو ہو تو اس کی حاکمیت سراسر ظلم و فساد ہوگی۔ اِسی لیے جن فلسفیوں نے کسی انسان، یا انسانی ادارے، یا انسانوں کے مجموعے کو حاکمیت کا حامل قرار دیا ہے، ان کو یہ فرض کرنا پڑا ہے کہ وہ غلطی سے مُبَرّا ہوگا۔ مگر ظاہر ہے کہ نہ تو غیرمحدود حاکمیت فی الواقع کسی انسانی اقتدار کو حاصل ہوسکتی ہے، اور نہ یہی ممکن ہے کہ کسی بادشاہ، یا پارلیمنٹ، یا قوم، یا پارٹی کو ایک محدُود دائرے میں جو حاکمیت حاصل ہو، اُسے وہ بے عیب اور بے خطا طریقے سے استعمال کر سکے۔ اِس لیے کہ ایسی حکمت جس میں نادانی کا شائبہ نہ ہو، اور ایسا علم جو تمام متعلقہ حقائق پر حاوی ہو، سرے سے پوری نوعِ انسانی ہی کو حاصل نہیں ہے، کجا کہ وہ انسانوں میں سے کسی شخص یا ادارے یا قوم کو نصیب ہو جائے۔ اور اِسی طرح انسان جب تک انسان ہے، اس کا خودغرضی، نفسانیت، خوف، لالچ، خواہشات، تعصّب اور جذباتی رضا ورغبت اور محبّت ونفرت سے بالکل پاک اور بالاتر ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ اِن حقائق کو اگر کوئی شخص نگاہ میں رکھ کر غور کرے تو اسے محسوس ہوگا کہ قرآن اپنے اِس بیان میں درحقیقت حاکمیت کا بالکل صحیح اور مکمل تصوّر پیش کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''عزیز''، یعنی اقتدارِ مُطلَق کا حامل اِس کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں ہے، اور اِس غیرمحدُود اقتدار کے ساتھ وہی ایک ہستی

QuranUrdu.com

شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الۡاَوَّلُ وَ الۡاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الۡبَاطِنُ ۚ وَ هُوَ
بِكُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ فِیۡ
سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰی عَلَی الۡعَرۡشِ ؕ یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ

قدرت رکھتا ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی، اور ظاہر بھی ہے اور مخفی بھی،[۳] اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا۔[۴] اُس کے علم میں ہے جو کچھ

ایسی ہے جو بے عیب ہے، حکیم وعلیم ہے، رحیم وغفور ہے اور حمید وو ہاب ہے۔

۳ ۔ یعنی جب کچھ نہ تھا تو وہ تھا، اور جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا۔ وہ سب ظاہروں سے بڑھ کر ظاہر ہے، کیونکہ دنیا میں جو کچھ بھی ظہور ہے اُسی کی صفات اور اسی کے افعال اور اسی کے نُور کا ظُہور ہے۔ اور وہ ہر مخفی سے بڑھ کر مخفی ہے، کیونکہ حواس سے اس کی ذات کو محسوس کرنا تو درکنار، عقل وفکر وخیال تک اس کی کُنہ وحقیقت کو نہیں پا سکتے۔ اِس کی بہترین تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دُعا کے یہ الفاظ ہیں جنھیں امام احمد، مسلم، ترمذِی اور بیہقی نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اور حافظ ابو یَعلیٰ مَوصِلی نے اپنی مُسند میں حضرت عائشہؓ سے نقل کیا ہے:

انت الاوّل فلیس قبلك شیء	تو ہی پہلا ہے، کوئی تجھ سے پہلے نہیں
وانت الاٰخر فلیس بعدك شیء	تو ہی آخر ہے، کوئی تیرے بعد نہیں
وانت الظاهر فلیس فوقك شیء	تو ہی ظاہر ہے، کوئی تجھ سے اُوپر نہیں
وانت الباطن فلیس دونك شیء	تو ہی باطن ہے، کوئی تجھ سے مخفی تر نہیں

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید میں اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے لیے خُلُود اور اَبدی زندگی کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کے ساتھ یہ بات کیسے نبھ سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آخر ہے، یعنی جب کچھ نہ رہے گا تو وہ رہے گا؟ اس کا جواب خود قرآنِ مجید ہی میں موجود ہے کہ كُلُّ شَیۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (القصص: ۸۸) یعنی ”ہر چیز فانی ہے اللہ کی ذات کے سوا“۔ دوسرے الفاظ میں ذاتی بقا کسی مخلوق کے لیے نہیں ہے۔ اگر کوئی چیز باقی ہے یا باقی رہے تو وہ اللہ کے باقی رکھنے ہی سے باقی ہے اور اس کے باقی رکھنے ہی سے باقی رہ سکتی ہے، ورنہ بذاتِ خود اُس کے سوا سب فانی ہیں۔ جنت اور دوزخ میں کسی کو خلود اس لیے نہیں ملے گا کہ وہ بجائے خود غیر فانی ہے، بلکہ اس لیے ملے گا کہ اللہ اس کو حیاتِ اَبدی عطا فرمائے گا۔ یہی معاملہ فرشتوں کا بھی ہے کہ وہ بذاتِ خود غیر فانی نہیں ہیں۔ جب اللہ نے چاہا تو وہ وجود میں آئے، اور جب تک وہ چاہے اُسی وقت تک وہ موجود رہ سکتے ہیں۔

۴ ۔ یعنی کائنات کا خالق بھی وہی ہے اور فرمانروا بھی وُہی۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد دوم،

QuranUrdu.com

فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ
فِيهَا ۖ وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٤﴾ لَهُ
مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٥﴾ يُولِجُ اللَّيْلَ
فِي النَّهَارِ وَيُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٦﴾

زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے، اور جو کچھ آسمان سے اُترتا ہے اور جو کچھ اُس میں چڑھتا ہے[5]۔ وہ تمھارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو[6]۔ جو کام بھی تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔ وہی زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے اور تمام معاملات فیصلے کے لیے اُسی کی طرف رُجوع کیے جاتے ہیں۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔

الاعراف، حواشی ۴۱ - ۴۲۔ یونس، حاشیہ ۴۔ الرعد، حواشی ۲ تا ۵۔ جلد چہارم، حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

۵ - بالفاظِ دیگر، وہ محض کُلّیات ہی کا عالم نہیں ہے بلکہ جزئیات کا علم بھی رکھتا ہے۔ ایک ایک دانہ جو زمین کی تہوں میں جاتا ہے، ایک ایک پتّی اور کونپل جو زمین سے پھُوٹتی ہے، بارش کا ایک ایک قطرہ جو آسمان سے گرتا ہے، اور بخارات کی ہر مقدار جو سمندروں اور جھیلوں سے اُٹھ کر آسمان کی طرف جاتی ہے، اس کی نگاہ میں ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ کون سا دانہ زمین میں کس جگہ پڑا ہے، تبھی تو وہ اسے پھاڑ کر اس میں سے کونپل نکالتا ہے اور اسے پرورش کر کے بڑھاتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کہ بخارات کی کتنی کتنی مقدار کہاں کہاں سے اُٹھی ہے اور کہاں پہنچی ہے، تبھی تو وہ ان سب کو جمع کر کے بادل بناتا ہے اور زمین کے مختلف حصّوں پر بانٹ کر ہر جگہ ایک حساب سے بارش برساتا ہے۔ اِسی پر اُن دوسری تمام چیزوں کی تفصیلات کو قیاس کیا جا سکتا ہے جو زمین میں جاتی اور اس سے نکلتی ہیں، اور آسمان کی طرف چڑھتی اور اس سے نازل ہوتی ہیں۔ ان سب پر اللہ کا علم حاوی نہ ہو تو ہر چیز کی علیٰحدہ علیٰحدہ تدبیر اور ہر ایک کا انتہائی حکیمانہ طریقے سے انتظام کیسے ممکن ہے۔

۶ - یعنی کسی جگہ بھی تم اُس کے علم، اُس کی قدرت، اُس کی فرمانروائی اور اس کی تدبیر و انتظام سے باہر نہیں ہو۔ زمین میں، ہوا میں، پانی میں، یا کسی گوشۂ تنہائی میں، جہاں بھی تم ہو، اللہ کو معلوم ہے کہ تم کہاں ہو۔ وہاں تمھارا زندہ ہونا بجائے خود اِس کی علامت ہے کہ اللہ اُسی جگہ تمھاری زندگی کا سامان کر رہا ہے۔ تمھارا دل اگر دھڑک رہا ہے،

QuranUrdu.com

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ؕ

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسُولؐ پر اور خرچ کرو اُن چیزوں میں سے جن پر اس نے تم کو خلیفہ

تمھارے پھیپھڑے اگر سانس لے رہے ہیں، تمھاری سماعت اور بینائی اگر کام کر رہی ہے تو یہ سب کچھ اِسی وجہ سے ہے کہ اللہ کے انتظام سے تمھارے جسم کے سب کَل پُرزے چل رہے ہیں۔ اور اگر کسی جگہ بھی تمھیں موت آتی ہے تو اِسی وجہ سے آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھاری بقا کا انتظام ختم کر کے تمھیں واپس بُلا لینے کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔

۷ – یہ خطاب غیر مسلموں سے نہیں ہے، بلکہ بعد کی پوری تقریر یہ ظاہر کر رہی ہے کہ مخاطَب وہ مسلمان ہیں جو کلمۂ اسلام کا اقرار کر کے ایمان لانے والوں کے گروہ میں شامل ہو چکے تھے، مگر ایمان کے تقاضے پُورے کرنے اور مومن کا سا طرزِ عمل اختیار کرنے سے پہلوتہی کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کو ایمان کی دعوت دینے کے ساتھ ہی فوراً اُن سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جہاد فی سبیل اللہ کے مَصارف میں دل کھول کر اپنا حصّہ ادا کرو، اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم میں سے جو فتح سے پہلے جہاد اور اِنفاق فی سبیل اللہ کرے گا، اُس کا درجہ اُن لوگوں سے بلند تر ہو گا جو بعد میں یہ خدمات انجام دیں گے۔ غیر مسلم کو دعوتِ ایمان دینے کی صورت میں تو پہلے اُس کے سامنے ایمان کے ابتدائی تقاضے پیش کیے جاتے ہیں نہ کہ انتہائی۔ اس لیے فحوائے کلام کے لحاظ سے یہاں اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے گروہ میں شامل ہو گئے ہو، اللہ اور اس کے رسولؐ کو سچّے دل سے مانو اور وہ طرزِ عمل اختیار کرو جو اخلاص کے ساتھ ایمان لانے والوں کو اختیار کرنا چاہیے۔

۸ – اس مقام پر خرچ کرنے سے مُراد عام بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنا نہیں ہے، بلکہ آیت ۱۰ کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یہاں اِس سے مُراد اُس جدّوجُہد کے مصارف میں حصہ لینا ہے جو اُس وقت کفر کے مقابلے میں اسلام کو سربلند کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں برپا تھی۔ خاص طور پر دو ضرورتیں اُس وقت ایسی تھیں جن کے لیے اسلامی حکومت کو مالی مدد کی سخت حاجت درپیش تھی۔ ایک، جنگی ضروریات۔ دوسرے، اُن مظلوم مسلمانوں کو سہارا دینا جو کفّار کے ظلم وستم سے تنگ آ کر عرب کے ہر حصّے سے ہجرت کر کے مدینے آئے تھے اور آ رہے تھے۔ مخلص اہلِ ایمان ان مصارف کو پُورا کرنے کے لیے اپنی ذات پر اتنا بوجھ برداشت کر رہے تھے جو ان کی طاقت اور وسعت سے بہت زیادہ تھا، اور اِسی چیز کی داد اُن کو آگے آیات ۱۰-۱۲-۱۸ اور ۱۹ میں دی گئی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے گروہ میں بکثرت اچھے خاصے کھاتے پیتے لوگ ایسے موجود تھے جو کفر و اسلام کی اِس کشمکش کو محض تماشائی بن کر دیکھ رہے تھے اور اِس بات کا انھیں کوئی احساس نہ تھا کہ جس چیز پر ایمان لانے کا وہ دعویٰ کر رہے ہیں، اس کے کچھ حُقوق بھی ان کی جان و مال پر عائد ہوتے ہیں۔ یہی دوسری قسم کے لوگ اِس آیت کے مخاطَب ہیں۔ اُن سے کہا جا رہا ہے کہ سچّے مومن بنو اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو۔

QuranUrdu.com

فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ اَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ﴿۷﴾ وَ مَا لَکُمۡ

بنایا ہے۔[9] جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں گے اور مال خرچ کریں گے،[10] اُن کے لیے بڑا اجر ہے۔ تمھیں کیا ہو گیا ہے

۹ – اس کے دو مطلب ہیں اور دونوں ہی یہاں مُراد بھی ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ جو مال تمھارے پاس ہے، یہ دراصل تمھارا ذاتی مال نہیں بلکہ اللہ کا بخشا ہوا مال ہے۔ تم بذاتِ خود اِس کے مالک نہیں ہو، اللہ نے اپنے خلیفہ کی حیثیت سے یہ تمھارے تَصَرُّف میں دیا ہے۔ لہٰذا مال کے اصل مالک کی خدمت میں اِسے صَرف کرنے سے دریغ نہ کرو۔ نائب کا یہ کام نہیں ہے کہ مالک کے مال کو مالک ہی کے کام میں خرچ کرنے سے جی چُرائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ مال نہ ہمیشہ سے تمھارے پاس تھا، نہ ہمیشہ تمھارے پاس رہنے والا ہے۔ کل یہ کچھ دوسرے لوگوں کے پاس تھا، پھر اللہ نے تم کو اُن کا جانشین بنا کر اِسے تمھارے حوالے کیا، پھر ایک وقت ایسا آئے گا جب یہ تمھارے پاس نہ رہے گا اور کچھ دوسرے لوگ اِس پر تمھارے جانشین بن جائیں گے۔ اِس عارضی جانشینی کی تھوڑی سی مدّت میں، جب کہ یہ تمھارے قبض وتَصَرُّف میں ہے، اسے اللہ کے کام میں خرچ کرو، تاکہ آخرت میں اس کا مستقل اور دائمی اجر تمھیں حاصل ہو۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ ترمِذی کی رِوایَت ہے کہ ایک مرتبہ آپؐ کے ہاں ایک بکری ذبح کر کے اُس کا گوشت تقسیم کیا گیا۔ آپؐ گھر میں تشریف لائے تو پوچھا: ”بکری میں سے کیا باقی رہا؟“ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: مَا بَقِیَ اِلَّا کَتِفُھَا ”ایک شانے کے سوا کچھ نہیں بچا۔“ فرمایا: بَقِیَ کلّھا غیر کتفھا ”ایک شانے کے سوا ساری بکری بچ گئی۔“ یعنی جو کچھ خدا کی راہ میں صرف ہوا، وہی دراصل باقی رہ گیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے پوچھا: ”یا رسولؐ اللہ! کس صدقے کا اجر سب سے زیادہ ہے؟“ فرمایا: اَنْ تَصَدَّقَ وانت صحیح شحیح تخشی الفقر و تأمل الغنیٰ، ولا تُمْھِل حتّٰی اذا بلغت الحلقوم قلت لفلان کذا ولفلان کذا وقد کان لفلان۔ ”یہ کہ تو صدقہ کرے اس حال میں کہ تو صحیح وتندرست ہو، مال کی کمی کے باعث اُسے بچا کر رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا ہو اور اسے کسی کام میں لگا کر زیادہ کما لینے کی اُمید رکھتا ہو۔ اُس وقت کا انتظار نہ کر کہ جب جان نکلنے لگے تو تُو کہے کہ یہ فلاں کو دیا جائے اور یہ فُلاں کو۔ اُس وقت تو یہ مال فلاں کو جانا ہی ہے۔“ (بخاری ومسلم) ایک اور حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: یقول ابن اٰدم مالی مالی، وھل لک من مالک الا ما اکلت فافنیت، اولبست فابلیتَ، اوتصدقت فامضیت؟ وما سوٰی ذٰلک فذاھب و تارکہ للناس۔ ”آدمی کہتا ہے: میرا مال، میرا مال۔ حالانکہ تیرے مال میں سے تیرا حصّہ اُس کے سوا کیا ہے جو تُو نے کھا کر ختم کر دیا، یا پہن کر پُرانا کر دیا، یا صدقہ کر کے آگے بھیج دیا؟ اُس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ تیرے ہاتھ سے جانے والا ہے اور تو اسے دوسروں کے لیے چھوڑ جانے والا ہے۔“ (مسلم)

۱۰ – یہاں پھر جہاد میں مال خرچ کرنے کو ایمان کا لازمی تقاضا اور اخلاص فی الایمان کی ضروری علامت قرار دیا گیا ہے۔ بالفاظِ دیگر، گویا یہ فرمایا گیا ہے کہ حقیقی اور مخلص مومن وہی ہے جو ایسے موقع پر مال صرف کرنے سے جی نہ چُرائے۔

QuranUrdu.com

لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ۚ وَ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَ قَدۡ اَخَذَ
مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ
اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ
بِکُمۡ لَرَءُوۡفٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۹﴾ وَ مَا لَکُمۡ اَلَّا تُنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ

کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لاتے، حالانکہ رسولؐ تمھیں اپنے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے[11] اور وہ تم سے عہد لے چکا ہے[12] اگر تم واقعی ماننے والے ہو۔ وہ اللہ ہی تو ہے جو اپنے بندے پر صاف صاف آیتیں نازل کر رہا ہے، تاکہ تمھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تم پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ زمین

۱۱ – یعنی تم یہ غیر ایمانی رَوِش اِس حالت میں اختیار کر رہے ہو کہ اللہ کا رسولؐ خود تمھارے درمیان موجود ہے اور دعوتِ ایمانی تمھیں کسی دُور دراز واسطے سے نہیں بلکہ براہِ راست اللہ کے رسولؐ کی زبان سے پہنچ رہی ہے۔

۱۲ – بعض مفسّرین نے اِس عہد سے مُراد اللہ کی بندگی کا وہ عہد لیا ہے جو ابتدائے آفرینش میں آدم علیہ السّلام کی پُشت سے اُن کی ذُرّیّت کو نکال کر لیا گیا تھا۔ اور بعض دوسرے مفسّرین نے اس سے مُراد وہ عہد لیا ہے جو ہر انسان کی فطرت اور اس کی فطری عقل میں اللہ کی بندگی کے لیے موجود ہے۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کا وہ شُعُوری عہد ہے جو ہر مسلمان ایمان لا کر اپنے رب سے باندھتا ہے۔ قرآنِ مجید میں ایک دوسری جگہ اِس عہد کا ذکر اِن الفاظ میں کیا گیا ہے:

وَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ وَ مِیۡثَاقَہُ الَّذِیۡ وَاثَقَکُمۡ بِہٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا ۫ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ○ (المائدہ:۷)	یاد رکھو اُس نعمت کو جو اللہ نے تم کو عطا کی ہے اور اُس عہد و پیمان کو جو اللہ نے تم سے لیا ہے، جب کہ تم نے کہا: ”ہم نے سُنا اور اطاعت قبول کی۔“ اور اللہ سے ڈرو، اللہ دلوں کا حال جانتا ہے۔

حدیث میں حضرت عُبادہؓ بن صامت کی رِوایت ہے کہ:

بَایَعۡنَا رَسُوۡلُ اللّٰہ صَلّی اللّٰہ عَلَیۡہِ وسلم علی السّمع والطاعۃ فی النشاط والکسل وعلی النفقۃ فی العسر و الیسُر	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی تھی کہ ہم چُستی اور سُستی، ہر حال میں سَمع و طاعت پر قائم رہیں گے، خوش حالی اور تنگ حالی،

QuranUrdu.com

وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا

اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے۔[۱۳] تم میں سے جو لوگ فتح کے بعد خرچ اور جہاد کریں گے وہ کبھی اُن لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جنھوں نے فتح سے پہلے خرچ اور جہاد کیا ہے۔ اُن کا درجہ بعد میں خرچ اور جہاد کرنے والوں سے بڑھ کر ہے اگرچہ اللہ نے دونوں ہی سے اچھے وعدے فرمائے ہیں۔[۱۴] جو کچھ

وعلی الامر بالمعروف والنھی عن المنکر وعلی ان نقول فی اللّٰہ تعالٰی ولا نخاف لَوْمَۃَ لَائِمٍ (مُسندِ احمد)

دونوں حالتوں میں راہِ خدا پر خرچ کریں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے منع کریں گے، اللہ کی خاطر حق بات کہیں گے، اور اس معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔

۱۳ – اس کے دو مطلب ہیں: ایک یہ کہ یہ مال تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والا نہیں ہے، ایک دن تمھیں لازماً اِسے چھوڑ کر ہی جانا ہے اور اللہ ہی اِس کا وارث ہونے والا ہے، پھر کیوں نہ اپنی زندگی میں اِسے اپنے ہاتھ سے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو، تاکہ اللہ کے ہاں اس کا اجر تمھارے لیے ثابت ہو جائے۔ نہ خرچ کرو گے تب بھی یہ اللہ ہی کے پاس واپس جا کر رہے گا، البتہ فرق یہ ہو گا کہ اُس پر تم کسی اجر کے مستحق نہ ہو گے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہوئے تم کو کسی فقر اور تنگ دستی کا اندیشہ لاحق نہ ہونا چاہیے، کیونکہ جس خدا کی خاطر تم اسے خرچ کرو گے، وہ زمین و آسمان کے سارے خزانوں کا مالک ہے، اُس کے پاس تمھیں دینے کو بس اُتنا ہی کچھ نہ تھا جو اس نے آج تمھیں دے رکھا ہے، بلکہ کل وہ تمھیں اس سے بہت زیادہ دے سکتا ہے۔ یہی بات ایک دوسری جگہ اس طرح فرمائی گئی ہے:

قُلْ اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ ؕ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝ (سبا: ۳۹)

اَے نبیؐ! ان سے کہو کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، اور جو کچھ تم خرچ کرتے ہو، اس کی جگہ وہی مزید رزق تمھیں دیتا ہے، اور وہ بہترین رازق ہے۔

۱۴ – یعنی اجر کے مستحق تو دونوں ہی ہیں، لیکن ایک گروہ کا رُتبہ دوسرے گروہ سے لازماً بلند تر ہے، کیونکہ اُس نے زیادہ سخت حالات میں اللہ تعالیٰ کی خاطر وہ خطرات مُول لیے جو دوسرے گروہ کو درپیش نہ تھے۔ اس نے ایسی حالت میں مال

QuranUrdu.com

ع ۱۷/۱۰

تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۱۰﴾ع مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ
لَہٗ وَ لَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ج یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی

تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے[15]ع

کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض، تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا کر واپس دے، اور اُس کے لیے بہترین اجر ہے[16] اُس دن جب کہ تم مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور

خرچ کیا جب دُور دُور کہیں یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ کبھی فتوحات سے اِس خرچ کی تلافی ہو جائے گی، اور اُس نے ایسے نازک دَور میں کفّار سے جنگ کی جب ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ دشمن غالب آ کر اسلام کا نام لینے والوں کو پِیس ڈالیں گے۔ مفسّرین میں سے مجاہد، قَتَادَہ اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں جس چیز کے لیے لفظ "فتح" استعمال کیا گیا ہے، اس کا اِطلاق فتحِ مکّہ پر ہوتا ہے، اور عامر شَعبِیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد صُلحِ حُدَیبیہ ہے۔ پہلے قول کو اکثر مفسّرین نے اختیار کیا ہے، اور دوسرے قول کی تائید میں حضرت ابوسعید خُدریؓ کی یہ روایت پیش کی جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے صُلحِ حُدَیبیہ کے زمانے میں فرمایا: "عنقریب ایسے لوگ آنے والے ہیں جن کے اعمال کو دیکھ کر تم لوگ اپنے اعمال کو حقیر سمجھو گے، مگر لو کان لاحدھم جبل من ذھب فانفقہ ما ادرک مُدّ احدکم ولا نصیفہ۔" ان میں سے کسی کے پاس پہاڑ برابر بھی سونا ہو اور وہ سارا کا سارا خدا کی راہ میں خرچ کر دے تو وہ تمھارے دو رُطل بلکہ ایک رُطل خرچ کرنے کے برابر بھی نہ پہنچ سکے گا۔" (ابنِ جَرِیر، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیہ، ابونُعَیم اَصْفَہانی) نیز اس کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت اَنَسؓ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دورانِ نِزاع میں حضرت خالدؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ سے کہا: "تم لوگ اپنی پچھلی خدمات کی بنا پر ہم سے دوں کی لیتے ہو۔" یہ بات جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپؐ نے فرمایا: "اُس خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر تم لوگ اُحُد کے برابر، یا پہاڑوں کے برابر سونا بھی خرچ کرو تو اِن لوگوں کے اعمال کو نہ پہنچ سکو گے۔" اس سے اِستدلال کیا جاتا ہے کہ اس آیت میں فتح سے مراد صُلحِ حُدَیبیہ ہے، کیونکہ حضرت خالدؓ اسی صلح کے بعد ایمان لائے تھے اور فتحِ مکّہ میں شریک تھے۔ لیکن اس خاص موقع پر فتح سے مراد خواہ صلحِ حُدَیبیہ لی جائے یا فتحِ مکّہ، بہرحال اِس آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ درجات کا یہ فرق بس اسی ایک فتح پر ختم ہو گیا ہے۔ بلکہ اُصولاً اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جب کبھی اسلام پر ایسا کوئی وقت آ جائے جس میں کفر اور کفّار کا پلڑا بہت بھاری ہو اور بظاہر اسلام کے غلبے کے آثار دُور دُور کہیں نظر نہ آتے ہوں، اُس وقت جو لوگ اسلام کی حمایت میں جانیں لڑائیں اور مال خرچ کریں، اُن کے مرتبے کو وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے جو کفر و اسلام کی کشمکش کا فیصلہ اسلام کے حق میں ہو جانے کے بعد قربانیاں دیں۔

۱۵- یعنی اللہ جس کو جو اجر اور مرتبہ بھی دیتا ہے، یہ دیکھ کر دیتا ہے کہ کس نے کن حالات میں کس جذبے کے

QuranUrdu.com

نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾

اُن کے آگے آگے اور ان کے دائیں جانب دَوڑ رہا ہوگا۔[۱۷] (ان سے کہا جائے گا کہ) "آج بشارت ہے تمھارے لیے"، جنّتیں ہوں گی جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔

ساتھ کیا عمل کیا ہے۔ اُس کی بانٹ اندھی بانٹ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک کا درجہ اور اس کے عمل کا اجر پُوری باخبری کے ساتھ متعیّن کرتا ہے۔

۱۶ — یہ اللہ تعالیٰ کی شانِ کریمی ہے کہ آدمی اگر اس کے بخشے ہوئے مال کو اُسی کی راہ میں صرف کرے تو اسے وہ اپنے ذمّے قرض قرار دیتا ہے، بشرطیکہ وہ قرضِ حَسَن (اچھا قرض) ہو، یعنی خالص نیت کے ساتھ کسی ذاتی غرض کے بغیر دیا جائے، کسی قسم کی ریا کاری اور شہرت و ناموری کی طلب اُس میں شامل نہ ہو، اُسے دے کر کسی پر احسان نہ جتایا جائے، اُس کا دینے والا صرف اللہ کی رضا کے لیے دے اور اُس کے سوا کسی کے اجر اور کسی کی خوشنودی پر نگاہ نہ رکھے۔ اس قرض کے متعلق اللہ کے دو وعدے ہیں: ایک یہ کہ وہ اس کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس دے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس پر اپنی طرف سے بہترین اجر بھی عطا فرمائے گا۔

حدیث میں حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی رِوایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی اور حضورؐ کی زبانِ مبارک سے لوگوں نے اس کو سُنا تو حضرت ابوالدَّحداح انصاریؓ نے عرض کیا: "یا رسولؐ اللہ! کیا اللہ تعالیٰ ہم سے قرض چاہتا ہے؟" حضورؐ نے جواب دیا: "ہاں، اے ابوالدَّحداح"۔ انھوں نے کہا: "ذرا اپنا ہاتھ مجھے دکھایئے۔" آپؐ نے اپنا ہاتھ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے آپؐ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا: "میں نے اپنے رب کو اپنا باغ قرض دے دیا۔" حضرت عبداللہؓ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اُس باغ میں کھجور کے ۶ سو درخت تھے، اُسی میں ان کا گھر تھا، وہیں ان کے بال بچّے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات کر کے وہ سیدھے گھر پہنچے اور بیوی کو پکار کر کہا: "دَحداح کی ماں! نکل آؤ، میں نے یہ باغ اپنے رب کو قرض دے دیا ہے۔" وہ بولیں: "تم نے نفع کا سودا کیا دَحداح کے باپ!"، اور اسی وقت اپنا سامان اور اپنے بچّے لے کر باغ سے نکل گئیں۔ (ابنِ ابی حاتم) اِس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مخلص اہلِ ایمان کا طرزِ عمل اُس وقت کیا تھا، اور اِسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی ہے کہ وہ کیسا قرضِ حَسَن ہے جسے کئی گنا بڑھا کر واپس دینے اور پھر اُوپر سے اجرِ کریم عطا کرنے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے۔

۱۷ — اس آیت اور بعد والی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ میدانِ حشر میں نور صرف مومنینِ صالحین کے لیے مخصوص ہوگا، رہے کفّار و منافقین اور فُسّاق و فُجّار، تو وہ وہاں بھی اُسی طرح تاریکی میں بھٹک رہے ہوں گے جس طرح دنیا میں بھٹکتے رہے تھے۔ وہاں روشنی جو کچھ بھی ہوگی، صالح عقیدے اور صالح عمل کی ہوگی۔ ایمان کی صداقت اور سیرت و کردار کی پاکیزگی

QuranUrdu.com

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ

اُس روز منافق مردوں اور عورتوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ مومنوں سے کہیں گے: ذرا ہماری طرف دیکھو تا کہ ہم تمھارے نُور سے کچھ فائدہ اُٹھائیں۔[18] مگران سے کہا جائے گا: پیچھے ہٹ جاؤ، اپنا نور کہیں اور تلاش کرو۔ پھران کے درمیان ایک دیوار حائل کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اُس دروازے کے اندر رحمت ہوگی

ہی نور میں تبدیل ہو جائے گی، جس سے نیک بندوں کی شخصیت جگمگا اُٹھے گی۔ جس شخص کا عمل جتنا تابندہ ہوگا، اُس کے وجود کی روشنی اتنی ہی زیادہ تیز ہوگی، اور جب وہ میدانِ حشر سے جنّت کی طرف چلے گا تو اس کا نور اُس کے آگے آگے دوڑ رہا ہوگا۔ اِس کی بہترین تشریح قَتَادَہؒ کی وہ مُرسَل رِوایت ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”کسی کا نور اتنا تیز ہوگا کہ مدینے سے عدن تک کی مَسافت کے برابر فاصلے تک پہنچ رہا ہوگا، اور کسی کا نور مدینے سے صَنعا تک، اور کسی کا اس سے کم، یہاں تک کہ کوئی مومن ایسا بھی ہوگا جس کا نُور اس کے قدموں سے آگے نہ بڑھے گا۔“ (ابنِ جَرِیر) بالفاظِ دیگر، جس کی ذات سے دنیا میں جتنی بھلائی پھیلی ہوگی، اس کا نُور اتنا ہی تیز ہوگا، اور جہاں جہاں تک دنیا میں اس کی بھلائی پہنچی ہوگی، میدانِ حشر میں اتنی ہی مسافت تک اس کے نُور کی شعاعیں دوڑ رہی ہوں گی۔

یہاں ایک سوال آدمی کے ذہن میں کھٹک پیدا کرسکتا ہے۔ وہ یہ کہ آگے آگے نور کا دوڑنا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر نور کا صرف دائیں جانب دوڑنا کیا معنیٰ؟ کیا ان کے بائیں جانب تاریکی ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنے دائیں ہاتھ پر روشنی لیے ہوئے چل رہا ہو تو اس سے روشن تو بائیں جانب بھی ہوگی، مگر امرِ واقعہ یہی ہوگا کہ روشنی اس کے دائیں ہاتھ پر ہے۔ اس بات کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث کرتی ہے جسے حضرت ابو ذرؓ اور ابو الدَّرداء نے روایت کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **اعرفهم بنورهم الذی یسعٰی بین ایدیهم وعن ایمانهم وعن شمائلهم**۔ ”میں اپنی اُمّت کے صالحین کو وہاں ان کے اُس نور سے پہچانوں گا جو اُن کے آگے اور ان کے دائیں اور بائیں دوڑ رہا ہوگا۔“ (حاکم، ابنِ ابی حاتم، ابنِ مَرْدُوْیَہ)

۱۸۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جب جنّت کی طرف جا رہے ہوں گے تو روشنی ان کے آگے ہوگی اور پیچھے منافقین اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہوں گے۔ اُس وقت وہ اُن اہلِ ایمان کو جو دنیا میں اُن کے ساتھ ایک ہی مُسلم معاشرے میں رہتے تھے، پکار پکار کر کہیں گے کہ ذرا ہماری طرف پلٹ کر دیکھو تا کہ ہمیں بھی کچھ روشنی مل جائے۔

QuranUrdu.com

قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿١٣﴾ يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى
وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ

اور باہر عذاب[19]۔ وہ مومنوں سے پکار پکار کر کہیں گے: کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے[20]؟ مومن جواب دیں گے: ہاں، مگر تم نے اپنے آپ کو خود فتنے میں ڈالا[21]، موقع پرستی کی[22]، شک میں پڑے رہے[23]، اور جھُوٹی توقعات

۱۹ — اس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنّت اس دروازے سے جنّت میں داخل ہو جائیں گے اور دروازہ بند کر دیا جائے گا۔ دروازے کے ایک طرف جنّت کی نعمتیں ہوں گی، اور دوسری طرف دوزخ کا عذاب۔ منافقین کے لیے اُس حدِّ فاصل کو پار کرنا ممکن نہ ہو گا جو اُن کے اور جنّت کے درمیان حائل ہو گی۔

۲۰ — یعنی کیا ہم تمھارے ساتھ ایک ہی مسلم معاشرے میں شامل نہ تھے؟ کیا ہم کلمہ گو نہ تھے؟ کیا تمھاری طرح ہم بھی نمازیں نہ پڑھتے تھے؟ روزے نہ رکھتے تھے؟ حج اور زکوٰۃ ادا نہ کرتے تھے؟ کیا تمھاری مجلسوں میں ہم شریک نہ ہوتے تھے؟ تمھارے ساتھ ہمارے شادی بیاہ اور رشتہ داری کے تعلقات نہ تھے؟ پھر آج ہمارے اور تمھارے درمیان یہ جدائی کیسی پڑ گئی؟

۲۱ — یعنی مسلمان ہو کر بھی تم مخلص مسلمان نہ بنے، ایمان اور کفر کے درمیان لٹکتے رہے، کفر اور کفار سے تمھاری دلچسپیاں کبھی ختم نہ ہوئیں، اور اسلام سے تم نے کبھی اپنے آپ کو پُوری طرح وابستہ نہ کیا۔

۲۲ — اصل الفاظ ہیں: تَرَبَّصْتُمْ۔ تَرَبُّص عربی زبان میں انتظار کرنے اور موقع کی تلاش میں ٹھیرے رہنے کو کہتے ہیں۔ جب کوئی شخص دو راستوں میں سے کسی ایک پر جانے کا قطعی فیصلہ نہ کرے، بلکہ اِس فکر میں کھڑا ہو کہ جدھر جانا مفید ہوتا نظر آئے اسی طرف چل پڑے، تو کہا جائے گا کہ وہ تَرَبُّص میں مبتلا ہے۔ منافقین نے کفر و اسلام کی کشمکش کے اُس نازک دَور میں یہی رَوِیّہ اختیار کر رکھا تھا۔ وہ نہ کھُل کر کفر کا ساتھ دے رہے تھے، نہ پُورے اطمینان کے ساتھ اپنی طاقت اسلام کی نصرت و حمایت میں صرف کر رہے تھے۔ بس اپنی جگہ بیٹھے یہ دیکھ رہے تھے کہ اِس قوت آزمائی میں آخر کار پلڑا کدھر جھکتا ہے، تاکہ اسلام کامیاب ہوتا نظر آئے تو اس کی طرف جھک جائیں اور اُس وقت مسلمانوں کے ساتھ کلمہ گوئی کا تعلق ان کے کام آئے، اور کفر کو غلبہ حاصل ہو تو اس کے حامیوں سے جا ملیں اور اسلام کی طرف سے جنگ میں کسی قسم کا حصّہ نہ لینا اُس وقت ان کے حق میں مفید ثابت ہو۔

۲۳ — اس سے مراد مختلف قسم کے شکوک ہیں جو ایک منافق کو لاحق ہوتے ہیں، اور وہی اس کی منافقت کا اصل سبب ہوا کرتے ہیں۔ اسے خدا کی ہستی میں شک ہوتا ہے، رسول کی رسالت میں شک ہوتا ہے، قرآن کے کتاب اللہ ہونے میں شک ہوتا ہے، آخرت اور وہاں کی باز پُرس اور جزا و سزا میں شک ہوتا ہے، اور اس امر میں شک ہوتا ہے کہ حق اور باطل کا یہ جھگڑا واقعی کوئی حقیقت بھی رکھتا ہے یا یہ سب محض ڈھکوسلے ہیں اور اصل چیز بس یہ ہے کہ خوش باش دے کہ زندگانی ایں است۔

QuranUrdu.com

الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا
يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ
مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ

تمھیں فریب دیتی رہیں، یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا،[۲۴] اور آخر وقت تک وہ بڑا دھوکے باز[۲۵] تمھیں اللہ کے معاملے میں دھوکا دیتا رہا۔ لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُن لوگوں سے جنھوں نے کھُلا کھُلا کفر کیا تھا۔[۲۶] تمھارا ٹھکانا جہنّم ہے، وہی تمھاری خبر گیری کرنے والی ہے،[۲۷] اور یہ بدترین انجام ہے۔

کیا ایمان لانے والوں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل اللہ کے ذکر سے پگھلیں اور اُس کے نازل کردہ حق کے آگے جھکیں،[۲۸] اور وہ اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنھیں

کوئی شخص جب تک ان شکوک میں مبتلا نہ ہو وہ کبھی منافق نہیں ہو سکتا۔

۲۴ – اس کے دو معنیٰ ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ تم کو موت آ گئی اور مرتے دم تک تم اس فریب سے نہ نکلے۔ دوسرے یہ کہ اسلام کو غلبہ نصیب ہو گیا اور تم تماشا دیکھتے رہ گئے۔

۲۵ – مُراد ہے شیطان۔

۲۶ – یہاں اس امر کی تصریح ہے کہ آخرت میں منافق کا انجام وہی ہو گا جو کافر کا ہو گا۔

۲۷ – اصل الفاظ ہیں: هِيَ مَوْلٰىكُمْ، ”دوزخ ہی تمھاری مَولیٰ ہے“۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ وہی تمھارے لیے موزوں جگہ ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ کو تو تم نے اپنا مَولیٰ بنایا نہیں کہ وہ تمھاری خبر گیری کرے، اب تو دوزخ ہی تمھاری مَولیٰ ہے، وہی تمھاری خوب خبر گیری کرے گی۔

۲۸ – یہاں پھر ”ایمان لانے والوں“ کے الفاظ تو عام ہیں مگر ان سے مُراد تمام مسلمان نہیں بلکہ مسلمانوں کا وہ خاص گروہ ہے جو ایمان کا اقرار کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں میں شامل ہو گیا تھا اور اس کے باوجود اسلام کے درد سے اس کا دل خالی تھا۔ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ کفر کی تمام طاقتیں اسلام کو مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہیں، چاروں طرف سے اُنھوں نے اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت پر نرغہ کر رکھا ہے، عرب کی سرزمین میں جگہ جگہ مسلمان تختۂ مشقِ ستم بنائے جا رہے ہیں، ملک کے

QuranUrdu.com

اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَ
كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝١٦ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ
بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝١٧

پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ایک لمبی مدّت اُن پر گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج ان میں سے اکثر فاسق بنے ہوئے ہیں؟[29] خوب جان لو کہ اللہ زمین کو اُس کی موت کے بعد زندگی بخشتا ہے، ہم نے نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی ہیں، شاید کہ تم عقل سے کام لو۔[30]

گوشے گوشے سے مظلوم مسلمان سخت بے سروسامانی کی حالت میں پناہ لینے کے لیے مدینے کی طرف بھاگے چلے آرہے ہیں، مخلص مسلمانوں کی کمر ان مظلوموں کو سہارا دیتے دیتے ٹوٹی جا رہی ہے، اور دشمنوں کے مقابلے میں بھی یہی مخلص مومن سربکف ہیں، مگر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ایمان کا دعوٰی کرنے والا یہ گروہ ٹس سے مَس نہیں ہو رہا تھا۔ اِس پر اُن لوگوں کو شرم دلائی جا رہی ہے کہ تم کیسے ایمان لانے والے ہو؟ اسلام کے لیے حالات نزاکت کی اِس حد کو پہنچ چکے ہیں، کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ کا ذکر سُن کر تمھارے دل پگھلیں اور اس کے دین کے لیے تمھارے دلوں میں ایثار و قربانی اور سرفروشی کا جذبہ پیدا ہو؟ کیا ایمان لانے والے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اللہ کے دین پر بُرا وقت آئے اور وہ اس کی ذرا سی ٹیس بھی اپنے دل میں محسوس نہ کریں؟ اللہ کے نام پر انھیں پکارا جائے اور وہ اپنی جگہ سے ہلیں تک نہیں؟ اللہ اپنی نازل کردہ کتاب میں خود چندے کی اپیل کرے، اور اسے اپنے ذمے قرض قرار دے، اور صاف صاف یہ بھی سُنا دے کہ ان حالات میں جو اپنے مال کو میرے دین سے عزیز تر رکھے گا وہ مومن نہیں بلکہ منافق ہوگا، اِس پر بھی ان کے دل نہ خدا کے خوف سے کانپیں، نہ اس کے حکم کے آگے جھکیں؟

۲۹ — یعنی یہود و نصارٰی تو اپنے انبیاؑ کے سیکڑوں برس بعد آج تمھیں اِس بے حسی اور رُوح کی مُردنی اور اَخلاق کی پستی میں مبتلا نظر آرہے ہیں۔ کیا تم اِتنے گئے گزرے ہو کہ ابھی رسول تمھارے سامنے موجود ہے، خدا کی کتاب نازل ہو رہی ہے، تمھیں ایمان لائے کچھ زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا ہے، اور ابھی سے تمھارا حال وہ ہو رہا ہے جو صدیوں تک خدا کے دین اور اس کی آیات سے کھیلتے رہنے کے بعد یہود و نصارٰی کا ہوا ہے؟

۳۰ — یہاں جس مناسبت سے یہ بات ارشاد ہوئی ہے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں متعدّد مقامات پر نبوت اور کتاب کے نزُول کو بارش کی برکات سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ انسانیت پر اس کے وہی اثرات مترتّب ہوتے ہیں جو زمین پر بارش کے ہُوا کرتے ہیں۔ جس طرح مُردہ پڑی ہوئی زمین بارانِ رحمت کا ایک چھینٹا پڑتے ہی لہلہا اُٹھتی ہے، اسی طرح جس مُلک میں اللہ کی رحمت سے ایک نبی مبعوث ہوتا ہے اور وحی و کتاب کا نزُول شروع ہوتا ہے، وہاں مری ہوئی انسانیت

QuranUrdu.com

اِنَّ الۡمُصَّدِّقِیۡنَ وَ الۡمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقۡرَضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ
لَہُمۡ وَ لَہُمۡ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ ﴿۱۸﴾ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖۤ اُولٰٓئِکَ
ہُمُ الصِّدِّیۡقُوۡنَ ٭ۖ وَ الشُّہَدَآءُ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ؕ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ

مَردوں اور عورتوں میں سے جو لوگ صدقات[۳۱] دینے والے ہیں اور جنھوں نے اللہ کو قرضِ حَسَن دیا ہے، اُن کو یقیناً کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا اور ان کے لیے بہترین اجر ہے۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں[۳۲] وہی اپنے رب کے نزدیک صِدّیق[۳۳] اور شہید ہیں[۳۴]، اُن کے لیے اُن کا اجر اور

یکا یک جی اُٹھتی ہے۔ اُس کے وہ جوہر کُھلنے لگتے ہیں جنھیں زمانہ ہائے دراز سے جاہلیّت نے پیوندِ خاک کر رکھا تھا۔ اُس کے اندر سے اَخلاقِ فاضلہ کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں اور خیرات وحَسَنات کے گلزار لہلہانے لگتے ہیں۔ اِس حقیقت کی طرف جس غرض کے لیے یہاں اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ضعیف الایمان مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں اور وہ اپنی حالت پر غور کریں۔ نبوت اور وحی کے بارانِ رحمت سے انسانیت جس شان سے ازسرِ نو زندہ ہو رہی تھی اور جس طرح اس کا دامن برکات سے مالا مال ہو رہا تھا، وہ ان کے لیے کوئی دُور کی داستان نہ تھی۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے صحابۂ کرامؓ کے پاکیزہ معاشرے میں اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ رات دن اس کا تجربہ اُن کو ہو رہا تھا۔ جاہلیّت بھی اپنے تمام مفاسد کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی، اور اسلام سے پیدا ہونے والے مَحاسن بھی اُن کے مقابلے میں اپنی پُوری بہار دکھا رہے تھے۔ اس لیے ان کو تفصیل کے ساتھ یہ باتیں بتانے کی کوئی حاجت نہ تھی۔ بس یہ اشارہ کر دینا کافی تھا کہ مُردہ زمین کو اللہ اپنے بارانِ رحمت سے کس طرح زندگی بخشتا ہے، اس کی نشانیاں تم کو صاف صاف دکھا دی گئی ہیں، اب تم خود عقل سے کام لے کر اپنی حالت پر غور کر لو کہ اس نعمت سے تم کیا فائدہ اُٹھا رہے ہو۔

۳۱- صَدَقہ اُردو زبان میں تو بہت ہی بُرے معنوں میں بولا جاتا ہے، مگر اسلام کی اصطلاح میں یہ اُس عَطِیّے کو کہتے ہیں جو سچّے دل اور خالص نیت کے ساتھ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جائے، جس میں کوئی ریا کاری نہ ہو، کسی پر احسان نہ جتایا جائے، دینے والا صرف اس لیے دے کہ وہ اپنے رب کے لیے عُبودیّت کا سچّا جذبہ رکھتا ہے۔ یہ لفظ صِدق سے ماخوذ ہے، اس لیے صداقت عین اس کی حقیقت میں شامل ہے۔ کوئی عَطِیّہ اور کوئی صَرفِ مال اُس وقت تک صَدَقہ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی تہ میں اِنفاق فی سبیل اللہ کا خالص اور بے کھوٹ جذبہ موجود نہ ہو۔

۳۲- یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ صادق الایمان لوگ ہیں جن کا طرزِ عمل جھوٹے مدّعیانِ ایمان اور ضعیف الایمان لوگوں سے بالکل مختلف تھا۔ جو اُس وقت ایک دوسرے سے بڑھ کر مالی قربانیاں دے رہے تھے اور اللہ کے دین کی خاطر جانیں لڑا رہے تھے۔

QuranUrdu.com

۳۳- یہ صِدق کا مبالغہ ہے۔ صادق سچّا، اور صِدّیق نہایت سچّا۔ مگر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ صِدق محض سچے اور مطابقِ حقیقت قول کو نہیں کہتے، بلکہ اس کا اطلاق صرف اُس قول پر ہوتا ہے جو بجائے خود بھی سچّا ہو اور جس کا قائل بھی سچے دل سے اُس حقیقت کو مانتا ہو جسے وہ زبان سے کہہ رہا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، تو یہ بات بجائے خود عین حقیقت کے مطابق ہے، کیونکہ آپؐ واقعی اللہ کے رسول ہیں، لیکن وہ شخص اپنے اِس قول میں صادق صرف اُسی وقت کہا جائے گا جب کہ اس کا اپنا عقیدہ بھی یہی ہو کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ لہٰذا صِدق کے لیے ضروری ہے کہ قول کی مطابقت حقیقت کے ساتھ بھی ہو اور قائل کے ضمیر کے ساتھ بھی۔ اسی طرح صدق کے مفہوم میں وفا اور خلوص اور عملی راست بازی بھی شامل ہے۔ صادق الوعد (وعدے کا سچّا) اس شخص کو کہیں گے جو عملاً اپنا وعدہ پُورا کرتا ہو اور کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کرتا ہو۔ صَدِیق (سچّا دوست) اسی کو کہا جائے گا جس نے آزمایش کے مواقع پر دوستی کا حق ادا کیا ہو اور کبھی آدمی کو اس سے بے وفائی کا تجربہ نہ ہوا ہو۔ جنگ میں صادق فی القِتال (سچّا سپاہی) صرف وہی شخص کہلائے گا جو جان توڑ کر لڑا ہو اور جس نے اپنے عمل سے اپنی بہادری ثابت کر دی ہو۔ پس صِدق کی حقیقت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ قائل کا عمل اُس کے قول سے مطابقت رکھتا ہو۔ قول کے خلاف عمل کرنے والا صادق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی بنا پر تو آپ اُس شخص کو جھوٹا واعظ کہتے ہیں جو کہے کچھ اور کرے کچھ۔ اب غور کرنا چاہیے کہ یہ تعریف جب صِدق اور صادق کی ہے تو مبالغے کے صیغے میں کسی کو صِدّیق کہنے کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کے معنٰی لازماً ایسے راست باز آدمی کے ہیں جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو، جو کبھی حق اور راستی سے نہ ہٹا ہو، جس سے یہ توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو کہ وہ کبھی اپنے ضمیر کے خلاف کوئی بات کہے گا، جس نے کسی بات کو مانا ہو تو پُورے خلوص کے ساتھ مانا ہو، اُس کی وفاداری کا حق ادا کیا ہو، اور اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہو کہ وہ فی الواقع ویسا ہی ماننے والا ہے جیسا ایک ماننے والے کو ہونا چاہیے۔ (مزید تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، النساء، حاشیہ ۹۹)

۳۴- اس آیت کی تفسیر میں اکابر مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ابنِ عباسؓ، مَسْرُوق، ضَحّاک، مُقاتِل بن حَیّان وغیرہ کہتے ہیں کہ أُولَٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ پر ایک جملہ ختم ہو گیا۔ اُس کے بعد وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۖ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ ایک الگ مستقل جُملہ ہے۔ اس تفسیر کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ”جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، وہی صِدّیق ہیں۔ اور شہدا کے لیے اُن کے رب کے ہاں اُن کا اجر اور اُن کا نُور ہے۔“ بخلاف اس کے مجاہدؒ اور متعدّد دوسرے مفسّرین اس پُوری عبارت کو ایک ہی جملہ مانتے ہیں اور ان کی تفسیر کے لحاظ سے ترجمہ وہ ہوگا جو اُوپر ہم نے متن میں کیا ہے۔ دونوں تفسیروں میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پہلے گروہ نے شہید کو مقتول فی سبیل اللہ کے معنٰی میں لیا ہے، اور یہ دیکھ کر کہ ہر مومن اس معنٰی میں شہید نہیں ہوتا، انھوں نے وَ الشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ کو ایک الگ جملہ قرار دے دیا ہے۔ مگر دوسرا گروہ شہید کو مقتول فی سبیل اللہ کے معنٰی میں نہیں بلکہ حق کی گواہی دینے والے کے معنٰی میں لیتا ہے، اور اس لحاظ سے ہر مومن شہید ہے۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری تفسیر قابلِ ترجیح ہے اور قرآن وحدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:

QuranUrdu.com

وَ نُوۡرُہُمۡ ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ
الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۹﴾ ع اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ
وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ
اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ
حُطٰمًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ

اُن کا نُور ہے[۳۵]۔ اور جن لوگوں نے کُفر کیا ہے اور ہماری آیات کو جُھٹلایا ہے وہ دوزخی ہیں۔ع

خُوب جان لو کہ یہ دنیا کی زندگی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک کھیل اور دل لگی اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تمھارا آپس میں ایک دُوسرے پر فخر جتانا اور مال و اولاد میں ایک دُوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش ہوگئی تو اس سے پیدا ہونے والی نباتات کو دیکھ کر کاشت کار خوش ہو گئے۔ پھر وہی کھیتی پک جاتی ہے اور تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد ہو گئی۔ پھر وہ بُھس بن کر رہ جاتی ہے۔ اِس کے برعکس آخرت وہ جگہ ہے جہاں سخت عذاب ہے اور اللہ کی مغفرت اور

وَ کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَہِیۡدًا ؕ (البقرہ:۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک متوسط اُمّت بنایا ہے، تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔
ہُوَ سَمّٰىکُمُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ ۬ۙ مِنۡ قَبۡلُ وَ فِیۡ ہٰذَا لِیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ شَہِیۡدًا عَلَیۡکُمۡ وَ تَکُوۡنُوۡا شُہَدَآءَ عَلَی النَّاسِ ۚ (الحج:۷۸)	اللہ نے پہلے بھی تمھارا نام مسلم رکھا تھا اور اس قرآن میں بھی (تمھارا یہی نام ہے) تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر گواہ۔

حدیث میں حضرت بَراءؓ بن عازب کی رِوایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انھوں نے یہ فرماتے سُنا: مؤمنوا امّتی شھدآء، "میری اُمّت کے مومن شہید ہیں"، پھر حضورؐ نے سورۂ حدید کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ (ابنِ جریر) ابنِ مَردُوْیَہ نے اسی معنٰی میں حضرت ابوالدّرداءؓ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من فرّ بدینہ من ارضٍ مخافۃ الفتنۃ علٰی نفسہ ودینہ کتب عند اللہ صدیقا فاذا مات قبضہ اللہ شھیدًا ثم تلا ھٰذہ الاٰیۃ "جو شخص اپنی جان اور اپنے دین کو فتنے سے بچانے کے لیے کسی سرزمین سے نکل جائے، وہ اللہ کے ہاں

QuranUrdu.com

رِضْوَانٌ ؕ وَ مَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْۤا اِلٰی
مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ۙ

اس کی خوشنودی ہے۔ دنیا کی زندگی ایک دھوکے کی ٹٹّی کے سوا کچھ نہیں۔[۳۶] دَوڑو اور ایک دُوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو[۳۷] اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت آسمان وزمین

صدیق لکھا جاتا ہے، اور جب وہ مرتا ہے تو اللہ شہید کی حیثیت سے اس کی رُوح قبض فرماتا ہے''، پھر یہ بات ارشاد فرمانے کے بعد حضورؐ نے یہی آیت پڑھی۔ (شہادت کے اس مفہوم کی تشریح کے لیے مُلاحظہ ہو: تفہیم القرآن، جلد اوّل، البقرہ، حاشیہ ۱۴۴۔ النساء، حاشیہ ۹۹۔ جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۸۲)

۳۵ — یعنی ان میں سے ہر ایک جس مرتبے کے اجر اور جس درجے کے نُور کا مستحق ہوگا، وہ اس کو ملے گا۔ وہ اپنا اپنا اجر اور اپنا اپنا نُور پائیں گے۔ اُن کے لیے ان کا حصّہ آج ہی سے محفوظ ہے۔

۳۶ — اس مضمون کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کے حسبِ ذیل مقامات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے: سورۂ آلِ عمران، آیات ۱۴-۱۵، یونُس: ۲۴-۲۵، ابراہیم: ۱۸، الکہف: ۴۵-۴۶، النور: ۳۹۔ اِن سب مقامات پر جو بات انسان کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ دنیا کی زندگی دراصل ایک عارضی زندگی ہے۔ یہاں کی بہار بھی عارضی ہے اور خزاں بھی عارضی۔ دل بہلانے کا سامان یہاں بہت کچھ ہے، مگر درحقیقت وہ نہایت حقیر اور چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں، جنھیں اپنی کم ظرفی کی وجہ سے آدمی بڑی چیز سمجھتا ہے اور اِس دھوکے میں پڑ جاتا ہے کہ انھی کو پالینا گویا کامیابی کے منتہا تک پہنچ جانا ہے۔ حالانکہ جو بڑے سے بڑے فائدے اور لطف ولذّت کے سامان بھی یہاں حاصل ہونے ممکن ہیں، وہ بہت حقیر اور صرف چند سال کی حیاتِ مستعار تک محدود ہیں، اور ان کا حال بھی یہ ہے کہ تقدیر کی ایک ہی گردش خود اِسی دنیا میں ان سب پر جھاڑو پھیر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس کے برعکس آخرت کی زندگی ایک عظیم اور ابدی زندگی ہے۔ وہاں کے فائدے بھی عظیم اور مستقل ہیں اور نقصان بھی عظیم اور مستقل۔ کسی نے اگر وہاں اللہ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی پالی تو اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ نعمت نصیب ہوگئی جس کے سامنے دنیا بھر کی دولت وحکومت بھی ہیچ ہے۔ اور جو وہاں خدا کے عذاب میں گرفتار ہوگیا، اس نے اگر دنیا میں وہ سب کچھ بھی پالیا ہو جسے وہ اپنے نزدیک بڑی چیز سمجھتا تھا، تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ بڑے خسارے کا سودا کر کے آیا ہے۔

۳۷ — اصل میں لفظ سَابِقُوْٓا استعمال ہوا ہے، جس کا مفہوم محض ''دوڑو'' کے لفظ سے ادا نہیں ہوتا۔ مُسابَقت کے معنی مقابلے میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم دنیا کی دولت اور لذّتیں اور فائدے سمیٹنے میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی جو کوشش کر رہے ہو، اسے چھوڑ کر اِس چیز کو ہدفِ مقصود بناؤ اور اِس کی طرف دوڑنے میں بازی جیت لے جانے کی کوشش کرو۔

QuranUrdu.com

اُعِدَّتۡ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضۡلُ اللّٰهِ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ
يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۲۱﴾ مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى
الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ ﴿۲۲﴾ لِّـكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا

جیسی ہے[۳۸]، جو مہیّا کی گئی ہے اُن لوگوں کے لیے جو اللہ اور اُس کے رسولوں پر ایمان لائے ہوں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمھارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے[۳۹] ایک کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو[۴۰]۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بہت آسان کام ہے[۴۱]۔ (یہ سب کچھ اس لیے ہے) تاکہ جو کچھ بھی نقصان تمھیں ہو اس پر تم دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمھیں

۳۸- اصل الفاظ ہیں: عَرۡضُهَا كَعَرۡضِ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ۔ بعض مفسّرین نے عرض کو چوڑائی کے معنیٰ میں لیا ہے۔ لیکن دراصل یہاں یہ لفظ وسعت و پہنائی کے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ''عرض'' صرف چوڑائی ہی کے لیے نہیں بولا جاتا جو طول کا مدِّمقابل ہے، بلکہ اسے مجرّد وسعت کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: فَذُوۡ دُعَآءٍ عَرِيۡضٍ، ''انسان پھر لمبی چوڑی دعائیں کرنے لگتا ہے۔'' (حٰم السجدہ:۵۱) اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اس ارشاد سے مقصود جنت کا رقبہ بتانا نہیں ہے بلکہ اس کی وسعت کا تصوّر دلانا ہے۔ یہاں اس کی وسعت آسمان و زمین جیسی بتائی گئی ہے، اور سورۂ آلِ عمران میں فرمایا گیا ہے: سَارِعُوۡۤا اِلٰى مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۙ (آیت:۱۳۳) ''دوڑو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنّت کی طرف جس کی وسعت ساری کائنات ہے، جو مہیّا کی گئی ہے متّقی لوگوں کے لیے۔'' ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھنے سے کچھ ایسا تصوّر ذہن میں آتا ہے کہ جنت میں ایک انسان کو جو باغ اور محلات ملیں گے، وہ تو صرف اُس کے قیام کے لیے ہوں گے، مگر درحقیقت پُوری کائنات اُس کی سیرگاہ ہوگی۔ کہیں وہ بند نہ ہوگا۔ وہاں اس کا حال اِس دنیا کی طرح نہ ہوگا کہ چاند جیسے قریب ترین سیّارے تک پہنچنے کے لیے بھی وہ برسوں پاپڑ بیلتا رہا اور اِس ذرا سے سفر کی مشکلات کو رفع کرنے میں اسے بے تحاشا وسائل صرف کرنے پڑے۔ وہاں ساری کائنات اس کے لیے کُھلی ہوگی، جو کچھ چاہے گا اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے دیکھ لے گا، اور جہاں چاہے گا بے تکلّف جا سکے گا۔

QuranUrdu.com

بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۙ ﴿۲۳﴾ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ

عطا فرمائے اس پر پُھول نہ جاؤ۔[42] اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں، جو خود بُخل کرتے ہیں اور دُوسروں کو بُخل کرنے پر اکساتے ہیں۔[43] اب اگر کوئی رُوگردانی کرتا ہے تو اللہ

۳۹ – ''اُس کو'' کا اشارہ مصیبت کی طرف بھی ہو سکتا ہے، زمین کی طرف بھی، نفس کی طرف بھی، اور فحوائے کلام کے لحاظ سے مخلوقات کی طرف بھی۔

۴۰ – کتاب سے مراد ہے نوشتۂ تقدیر۔

۴۱ – یعنی اپنی مخلوقات میں سے ایک ایک کی تقدیر پہلے سے لکھ دینا اللہ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

۴۲ – اس سلسلۂ بیان میں یہ بات جس غرض کے لیے فرمائی گئی ہے، اسے سمجھنے کے لیے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جو اِس سورت کے نُزول کے وقت اہلِ ایمان کو پیش آ رہے تھے۔ ہر وقت دشمنوں کے حملے کا خطرہ، پے در پے لڑائیاں، دائماً محاصرے کی سی کیفیت، کفّار کے مَعاشی مقاطعے کی وجہ سے سخت بدحالی، عرب کے گوشے گوشے میں ایمان لانے والوں پر کفار کا ظلم وستم، یہ کیفیات تھیں جن سے مسلمان اُس وقت گزر رہے تھے۔ کفّار اِن کو مسلمانوں کے مخذول اور راندۂ درگاہ ہونے کی دلیل قرار دیتے تھے۔ منافقین اِنھیں اپنے شکوک وشبہات کی تائید میں استعمال کرتے تھے۔ اور مخلص اہلِ ایمان اگرچہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ اِن حالات کا مقابلہ کر رہے تھے، مگر بعض اوقات مصائب کا ہجوم ان کے لیے بھی انتہائی صبر آزما ہو جاتا تھا۔ اس پر مسلمانوں کو تسلّی دینے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر کوئی مصیبت بھی معاذ اللہ تمھارے رب کی بے خبری میں نازل نہیں ہو گئی ہے۔ جو کچھ پیش آ رہا ہے، یہ سب اللہ کی طے شدہ اسکیم کے مطابق ہے، جو پہلے سے اس کے دفتر میں لکھی ہوئی موجود ہے۔ اور اِن حالات سے تمھیں اس لیے گزارا جا رہا ہے کہ تمھاری تربیت پیشِ نظر ہے۔ جو کارِ عظیم اللہ تعالیٰ تم سے لینا چاہتا ہے، اس کے لیے یہ تربیَت ضروری ہے۔ اس سے گزارے بغیر تمھیں کامیابی کی منزل پر پہنچا دیا جائے تو تمھاری سیرت میں وہ خامیاں باقی رہ جائیں گی جن کی بدولت نہ تم عظمت واقتدار کی ثقیل خوراک ہضم کر سکو گے اور نہ باطل کی طوفان خیز موجوں کے تھپیڑے سہ سکو گے۔

۴۳ – یہ اشارہ ہے اُس سیرت کی طرف جو خود مُسلم معاشرے کے منافقین میں اُس وقت سب کو نظر آ رہی تھی۔ ظاہری اقرارِ ایمان کے لحاظ سے اُن میں اور مُخلص مسلمانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ لیکن اخلاص کے فُقدان کی وجہ سے وہ اُس تربیت میں شامل نہ ہوئے تھے جو مُخلصین کو دی جا رہی تھی، اس لیے ان کا حال یہ تھا کہ جو ذرا سی خوش حالی اور مَشیخَت اُن کو عرب کے ایک معمولی قصبے میں میسّر آئی ہوئی تھی، وہی اُن کے چھوٹے سے ظرف کو پُھلائے دے رہی تھی، اُسی پر وہ پھٹے پڑتے تھے، اور دل کی تنگی اِس درجے کی تھی کہ جس خدا پر ایمان لانے اور جس رسول کے پیرو ہونے اور جس دین کو ماننے کا دعوٰی

QuranUrdu.com

الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ﴿٢٤﴾ لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَٰتِ وَأَنزَلْنَا
مَعَهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۖ وَأَنزَلْنَا
الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَٰفِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ

بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔[۴۴]

ہم نے اپنے رسولوں کو صاف صاف نشانیوں اور ہدایات کے ساتھ بھیجا، اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں[۴۵]، اور لوہا اُتارا جس میں بڑا زور ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں۔[۴۶] یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اللہ کو معلوم ہو جائے کہ

کرتے تھے، اس کے لیے خود ایک پیسا تو کیا دیتے، دوسرے دینے والوں کو بھی یہ کہہ کر روکتے تھے کہ کیوں اپنا پیسا اِس بھاڑ میں جھونک رہے ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر مصائب کی بھٹّی گرم نہ کی جاتی تو اس کھوٹے مال کو، جو اللہ کے کسی کام کا نہ تھا، زرِ خالص سے الگ نہ کیا جا سکتا تھا، اور اُس کو الگ کیے بغیر کچّے پکّے مسلمانوں کی ایک مخلوط بھیڑ کو دنیا کی امامت کا وہ منصبِ عظیم نہ سونپا جا سکتا تھا جس کی عظیم الشان برکات کا مشاہدہ آخر کار دنیا نے خلافتِ راشدہ میں کیا۔

۴۴- یعنی یہ کلماتِ نصیحت سننے کے بعد بھی اگر کوئی شخص اللہ اور اس کے دین کے لیے خلوص، فرمانبرداری اور ایثار و قربانی کا طریقہ اختیار نہیں کرتا اور اپنی اُسی کج روی پر اَڑا رہنا چاہتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہے، تو اللہ کو اُس کی کچھ پروا نہیں۔ وہ غنی ہے، اس کی کوئی حاجت اِن لوگوں سے اٹکی ہوئی نہیں ہے۔ اور وہ ستودہ صفات ہے، اُس کے ہاں اچھی صفات رکھنے والے لوگ ہی مقبول ہو سکتے ہیں، بدکردار لوگ اُس کی نگاہِ التفات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

۴۵- اس مختصر سے فقرے میں انبیا علیہم السلام کے مشن کا پورا لُبِّ لُباب بیان کر دیا گیا ہے جسے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں خدا کے جتنے رسول بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے، وہ سب تین چیزیں لے کر آئے تھے:

(۱) بیّنات، یعنی کھلی کھلی نشانیاں، جو واضح کر رہی تھیں کہ یہ واقعی اللہ کے رسول ہیں، بنے ہوئے لوگ نہیں ہیں۔ روشن دلائل، جو اس بات کو ثابت کرنے کے لیے بالکل کافی تھے کہ جس چیز کو وہ حق کہہ رہے ہیں وہ واقعی حق ہے، اور جس چیز کو وہ باطل قرار دے رہے ہیں وہ واقعی باطل ہے۔ واضح ہدایات، جن میں کسی اشتباہ کے بغیر صاف صاف بتا دیا گیا تھا کہ عقائد، اَخلاق، عبادات اور معاملات میں لوگوں کے لیے راہِ راست کیا ہے جسے وہ اختیار کریں، اور غلط راستے کون سے ہیں جن سے وہ اجتناب کریں۔

QuranUrdu.com

مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ وَ رُسُلَہٗ بِالۡغَیۡبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ ﴿۲۵﴾ ع

کون اُس کو دیکھے بغیر اس کی اور اُس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ ۴۷ ع

(۲) کتاب، جس میں وہ ساری تعلیمات لکھ دی گئی تھیں جو انسان کی ہدایت کے لیے درکار تھیں، تاکہ لوگ رہنمائی کے لیے اُس کی طرف رُجوع کر سکیں۔

(۳) میزان، یعنی وہ معیارِ حق و باطل جو ٹھیک ٹھیک ترازُو کی تول تول کر یہ بتا دے کہ افکار، اخلاق اور معاملات میں اِفراط و تفریط کی مختلف انتہاؤں کے درمیان انصاف کی بات کیا ہے۔

اِن تین چیزوں کے ساتھ انبیا علیہم السّلام کو جس مقصد کے لیے بھیجا گیا، وہ یہ تھا کہ دنیا میں انسان کا رَویّہ اور انسانی زندگی کا نظام، فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی، عدل پر قائم ہو۔ ایک طرف ہر انسان اپنے خدا کے حُقوق، اپنے نفس کے حقوق اور اُن تمام بندگانِ خدا کے حقوق، جن سے اُس کو کسی طور پر سابقہ پیش آتا ہے، ٹھیک ٹھیک جان لے اور پُورے انصاف کے ساتھ اُن کو ادا کرے۔ اور دوسری طرف اجتماعی زندگی کا نظام ایسے اُصولوں پر تعمیر کیا جائے جن سے معاشرے میں کسی نوعیت کا ظلم باقی نہ رہے، تمدُّن و تہذیب کا ہر پہلو اِفراط و تفریط سے محفوظ ہو، حیاتِ اجتماعی کے تمام شعبوں میں صحیح صحیح توازُن قائم ہو، اور معاشرے کے تمام عناصر انصاف کے ساتھ اپنے حُقوق پائیں اور اپنے فرائض ادا کریں۔ بالفاظِ دیگر، انبیا علیہم السلام کی بِعثَت کا مقصود عدلِ انفرادی بھی تھا اور عدلِ اجتماعی بھی۔ وہ ایک ایک فرد کی شخصی زندگی میں بھی عدل قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ اس کے ذہن، اس کی سیرت، اس کے کردار اور اس کے برتاؤ میں توازُن پیدا ہو۔ اور انسانی معاشرے کے پُورے نظام کو بھی عدل پر قائم کرنا چاہتے تھے، تاکہ فرد اور جماعت دونوں ایک دوسرے کی روحانی، اَخلاقی اور مادّی فلاح میں مانع و مزاحم ہونے کے بجائے معاون و مددگار ہوں۔

۴۶ – ”لوہا اُتارنے“ کا مطلب زمین میں لوہا پیدا کرنا ہے، جیسا کہ ایک دوسری جگہ قرآن میں فرمایا: وَ اَنۡزَلَ لَکُمۡ مِّنَ الۡاَنۡعَامِ ثَمٰنِیَۃَ اَزۡوَاجٍ (الزُّمَر:۶) ”اُس نے تمھارے لیے مویشیوں کی قسم کے آٹھ نر و مادہ اُتارے۔“ چونکہ زمین میں جو کچھ پایا جاتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے یہاں آیا ہے، خود بخود نہیں بن گیا ہے، اس لیے ان کے پیدا کیے جانے کو قرآنِ مجید میں نازل کیے جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

انبیا علیہم السّلام کے مشن کو بیان کرنے کے معاً بعد یہ فرمانا کہ ”ہم نے لوہا نازل کیا، جس میں بڑا زور اور لوگوں کے لیے منافع ہیں“، خود بخود اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں لوہے سے مراد سیاسی اور جنگی طاقت ہے، اور کلام کا مدّعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُولوں کو قیامِ عدل کی محض ایک اسکیم پیش کر دینے کے لیے مبعوث نہیں فرمایا تھا، بلکہ یہ بات بھی ان کے مشن میں شامل تھی کہ اُس کو عملاً نافذ کرنے کی کوشش کی جائے اور وہ قوّت فراہم کی جائے جس سے فی الواقع عدل قائم ہو سکے، اُسے درہم برہم کرنے والوں کو سزا دی جا سکے اور اُس کی مزاحمت کرنے والوں

QuranUrdu.com

وَ لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا وَّ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ جَعَلۡنَا فِیۡ ذُرِّیَّتِہِمَا النُّبُوَّۃَ
وَ الۡکِتٰبَ فَمِنۡہُمۡ مُّہۡتَدٍ ۚ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّیۡنَا

ہم[۴۸] نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو بھیجا اور اُن دونوں کی نسل میں نبوّت اور کتاب رکھ دی[۴۹]۔ پھر ان کی اولاد میں سے کسی نے ہدایت اختیار کی اور بہت سے فاسق ہو گئے[۵۰]۔ اُن کے بعد ہم نے پے در پے

کا زور توڑا جا سکے۔

۴۷- یعنی اللہ کو اِس مدد کی ضرورت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ کمزور ہے، اپنی طاقت سے یہ کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ طریقِ کار اس نے انسانوں کی آزمائش کے لیے اختیار فرمایا ہے اور اِسی آزمائش سے گزر کر انسان اپنی ترقی اور فلاح کی راہ پر آگے بڑھ سکتا ہے۔ اللہ تو ہر وقت یہ قدرت رکھتا ہے کہ جب چاہے اپنے ایک اشارے سے تمام کافروں کو مغلوب کر دے اور اپنے رسولوں کو اُن پر غلبہ و تسلُّط عطا فرما دے۔ مگر اِس میں پھر رسولوں پر ایمان لانے والوں کا کیا کمال ہو گا جس کی بنا پر وہ کسی انعام کے مستحق ہوں؟ اسی لیے اللہ نے اس کام کو اپنی غالب قدرت سے انجام دینے کے بجائے طریقِ کار یہ اختیار فرمایا کہ اپنے رسولوں کو بیّنات اور کتاب اور میزان دے کر انسانوں کے درمیان مبعوث کر دیا۔ ان کو اس بات پر مامور فرمایا کہ لوگوں کے سامنے عدل کا راستہ پیش کریں اور ظلم و جور اور بے انصافی سے باز آ جانے کی اُن کو دعوت دیں۔ انسانوں کو اِس امر کا پُورا اختیار دے دیا کہ ان میں سے جو چاہے رسولوں کی دعوت قبول کرے اور جو چاہے اسے ردّ کر دے۔ قبول کرنے والوں کو پکارا کہ آؤ، اِس عدل کے نظام کو قائم کرنے میں میرا اور میرے رسولوں کا ساتھ دو اور اُن لوگوں کے مقابلے میں جان توڑ جدّوجُہد کرو جو ظلم و جور کے نظام کو باقی رکھنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ انسانوں میں سے کون ہیں جو انصاف کی بات کو ردّ کرتے ہیں، اور کون ہیں جو انصاف کے مقابلے میں بے انصافی قائم رکھنے کے لیے اپنی جان لڑاتے ہیں، اور کون ہیں جو انصاف کی بات قبول کر لینے کے بعد اُس کی حمایت اور اُس کی خاطر جدّوجُہد کرنے سے جی چُراتے ہیں، اور کون ہیں جو اَن دیکھے خدا کی خاطر دنیا میں اِس حق کو غالب کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگا دیتے ہیں۔ اِس امتحان سے جو لوگ کامیاب ہو کر نکلیں گے، انھی کے لیے آیندہ ترقیوں کے دروازے کھلیں گے۔

۴۸- اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو رسول بیّنات اور کتاب اور میزان لے کر آئے تھے، ان کے ماننے والوں میں کیا بگاڑ پیدا ہوا۔

۴۹- یعنی جو رسول بھی اللہ کی کتاب لے کر آئے، وہ حضرت نوحؑ کی، اور ان کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے تھے۔

۵۰- یعنی نافرمان ہو گئے، اللہ کی اطاعت کے دائرے سے نکل گئے۔

QuranUrdu.com

عَلٰٓى اٰثَارِهِمۡ بِرُسُلِنَا وَ قَفَّيۡنَا بِعِيۡسَى ابۡنِ مَرۡيَمَ وَاٰتَيۡنٰهُ
الۡاِنۡجِيۡلَ ۙ۬ وَجَعَلۡنَا فِىۡ قُلُوۡبِ الَّذِيۡنَ اتَّبَعُوۡهُ رَاۡفَةً وَّرَحۡمَةً ؕ وَ
رَهۡبَانِيَّةَ ۨابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ

اپنے رسول بھیجے، اور ان سب کے بعد عیسٰی ابنِ مریمؑ کو مبعوث کیا اور اُس کو انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے اس کی پیروی اختیار کی اُن کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔[51] اور رہبانیت[52] انھوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے اُسے اُن پر فرض نہیں کیا تھا، مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی[53]

۵۱ – اصل الفاظ ہیں: رافت اور رحمت۔ یہ دونوں لفظ قریب قریب ہم معنیٰ ہیں، مگر جب یہ ایک ساتھ بولے جاتے ہیں تو رافت سے مراد وہ رقیق القلبی ہوتی ہے جو کسی کو تکلیف و مصیبت میں دیکھ کر ایک شخص کے دل میں پیدا ہو۔ اور رحمت سے مراد وہ جذبہ ہوتا ہے جس کے تحت وہ اس کی مدد کی کوشش کرے۔ حضرت عیسٰی علیہ السّلام چونکہ نہایت رقیق القلب اور خلقِ خدا کے لیے رحیم و شفیق تھے، اس لیے ان کی سیرت کا یہ اثر ان کے پیروؤں میں سرایت کر گیا کہ وہ اللہ کے بندوں پر ترس کھاتے تھے اور ہمدردی کے ساتھ ان کی خدمت کرتے تھے۔

۵۲ – اس کا تلفظ رَہبانیت بھی کیا جاتا ہے اور رُہبانیت بھی۔ اس کا مادّہ رَہب ہے، جس کے معنیٰ خوف کے ہیں۔ رَہبانیّت کا مطلب ہے: مسلکِ خوف زدگی، اور رُہبانیت کے معنیٰ ہیں: مسلکِ خوف زدگان۔ اصطلاحاً اس سے مراد ہے کسی شخص کا خوف کی بنا پر (قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی کے ظلم کا خوف ہو، یا دنیا کے فتنوں کا خوف، یا اپنے نفس کی کمزوریوں کا خوف) تارک الدنیا بن جانا اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لینا، یا گوشہ ہائے عُزلت میں جا بیٹھنا۔

۵۳ – اصل الفاظ ہیں: اِلَّا ابۡتِغَآءَ رِضۡوَانِ اللّٰهِ۔ اِس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ ہم نے اُن پر اس رہبانیّت کو فرض نہیں کیا تھا، بلکہ جو چیز اُن پر فرض کی تھی وہ یہ تھی کہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ اور دوسرا مطلب یہ کہ یہ رہبانیّت ہماری فرض کی ہوئی نہ تھی، بلکہ اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انھوں نے اسے خود اپنے اُوپر فرض کر لیا تھا۔ دونوں صورتوں میں یہ آیت اس بات کی صراحت کرتی ہے کہ رہبانیّت ایک غیر اسلامی چیز ہے اور یہ کبھی دینِ حق میں شامل نہیں رہی ہے۔ یہی بات ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے کہ لَا رَھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ، ”اسلام میں کوئی رہبانیّت نہیں۔“ (مُسندِ احمد) ایک اور حدیث میں حضورؐ نے فرمایا: رھبانیۃ ھٰذہ الامّۃ الجھاد فی سبیل اللہِ، ”اِس اُمت کی رہبانیّت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔“ (مُسندِ احمد، مُسندِ ابی یَعلیٰ) یعنی اِس اُمت کے لیے روحانی ترقی کا راستہ ترکِ دنیا نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں جہاد ہے، اور یہ اُمت فتنوں سے ڈر کر جنگلوں اور پہاڑوں کی طرف نہیں بھاگتی بلکہ

QuranUrdu.com

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾

اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔[۵۴] اُن میں سے جو لوگ ایمان لائے ہوئے تھے اُن کا اجر ہم نے ان کو عطا کیا، مگر ان میں سے اکثر لوگ فاسق ہیں۔

راہِ خدا میں جہاد کر کے اُن کا مقابلہ کرتی ہے۔ بخاری و مسلم کی مُتَّفَق عَلَیْہِ روایت ہے کہ صحابہؓ میں سے ایک صاحب نے کہا: ''میں ہمیشہ ساری رات نماز پڑھا کروں گا۔'' دوسرے نے کہا: ''میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا۔'' تیسرے نے کہا: ''میں کبھی شادی نہ کروں گا اور عورت سے کوئی واسطہ نہ رکھوں گا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی یہ باتیں سنیں تو فرمایا: اما واللہ انی لأخشاکم للہ واتقاکم لہٗ لکنی اصوم واُفطر واُصلّی وارقُد واتزوج النساء، فمن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔ ''خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اُس سے تقویٰ کرتا ہوں۔ مگر میرا طریقہ یہ ہے کہ روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا، راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ جس کو میرا طریقہ پسند نہ ہو اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' حضرت اَنسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے: لا تشددوا علی انفسکم فیشدد اللہ علیکم فان قوما شددوا فشدد اللہ علیھم فتلک بقایاھُمْ فی الصّوامع والدیار۔ ''اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے۔ ایک گروہ نے یہی تشدُّد اختیار کیا تھا تو اللہ نے بھی پھر اسے سخت پکڑا۔ دیکھ لو، وہ ان کے بقایا راہب خانوں اور کنیسوں میں موجود ہیں۔'' (ابوداؤد)

۵۴- یعنی وہ دُہری غلطی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک غلطی یہ کہ اپنے اُوپر وہ پابندیاں عائد کیں جن کا اللہ نے کوئی حکم نہ دیا تھا۔ اور دوسری غلطی یہ کہ جن پابندیوں کو اپنے نزدیک اللہ کی خوشنودی کا ذریعہ سمجھ کر خود اپنے اُوپر عائد کر بیٹھے تھے اُن کا حق ادا نہ کیا اور وہ حرکتیں کیں جن سے اللہ کی خوشنودی کے بجائے اُلٹا اس کا غضب مول لے بیٹھے۔

اِس مقام کو پُوری طرح سمجھنے کے لیے ایک نظر مسیحی رہبانیّت کی تاریخ پر ڈال لینی چاہیے:

حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے ناآشنا تھا۔ مگر ابتدا ہی سے مسیحیّت میں اس کے جراثیم پائے جاتے تھے اور وہ تخیّلات اُس کے اندر موجود تھے جو اِس چیز کو جنم دیتے ہیں۔ ترک و تجرید کو اَخلاقی آئیڈیل قرار دینا اور درویشانہ زندگی کو شادی بیاہ اور دنیوی کاروبار کی زندگی کے مقابلے میں اعلیٰ و افضل سمجھنا ہی رہبانیت کی بنیاد ہے اور یہ دونوں چیزیں مسیحیت میں ابتدا سے موجود تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ تجرّد کو تقدُّس کا ہم معنیٰ سمجھنے کی وجہ سے کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی تھی کہ وہ شادی کریں، بال بچوں والے ہوں اور خانہ داری کے بکھیڑوں میں پڑیں۔ اسی چیز نے تیسری صدی تک پہنچتے پہنچتے ایک فتنے کی شکل اختیار کر لی اور رہبانیت

QuranUrdu.com

ایک وبا کی طرح مسیحیّت میں پھیلنی شروع ہوئی۔ تاریخی طور پر اس کے تین بڑے اسباب تھے:

ایک یہ کہ قدیم مشرک سوسائٹی میں شہوانیّت، بدکرداری اور دنیا پرستی جس شدّت کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی، اس کا توڑ کرنے کے لیے عیسائی علما نے اعتدال کی راہ اختیار کرنے کے بجائے انتہا پسندی کی راہ اختیار کی۔ انھوں نے عِفّت پر اتنا زور دیا کہ عورت اور مرد کا تعلق بجائے خود نجس قرار پا گیا، خواہ وہ نکاح ہی کی صورت میں ہو۔ انھوں نے دنیا پرستی کے خلاف اتنی شدت برتی کہ آخر کار ایک دین دار آدمی کے لیے سرے سے کسی قسم کی اَملاک رکھنا ہی گناہ بن گیا اور اَخلاق کا معیار یہ ہو گیا کہ آدمی بالکل مُفلس اور ہر لحاظ سے تارک الدنیا ہو۔ اسی طرح مشرک سوسائٹی کی لذت پرستی کے جواب میں وہ اس انتہا پر جا پہنچے کہ ترکِ لذّات، نفس کو مارنا اور خواہشات کا قَلع قَمع کر دینا اَخلاق کا مقصود بن گیا، اور طرح طرح کی ریاضتوں سے جسم کو اذیتیں دینا آدمی کی روحانیت کا کمال اور اُس کا ثبوت سمجھا جانے لگا۔

دوسرے یہ کہ مسیحیّت جب کامیابی کے دَور میں داخل ہو کر عوام میں پھیلنی شروع ہوئی تو اپنے مذہب کی توسیع و اشاعت کے شوق میں کلیسا ہر اُس بُرائی کو اپنے دائرے میں داخل کرتا چلا گیا جو عام لوگوں میں مقبول تھی۔ اولیا پرستی نے قدیم معبُودوں کی جگہ لے لی۔ ہورَس (Horus) اور آئسِس (Isis) کے مجسّموں کی جگہ مسیحؑ اور مریمؑ کے بُت پوجے جانے لگے۔ سیٹرنیلیا (Saturnalia) کی جگہ کرسمس کا تہوار منایا جانے لگا۔ قدیم زمانے کے تعویذ گنڈے، عملیات، فال گیری و غیب گوئی، جن بھوت بھگانے کے عمل، سب عیسائی درویشوں نے شروع کر دیے۔ اِسی طرح چونکہ عوام اُس شخص کو خدا رسیدہ سمجھتے تھے جو گندا اور ننگا ہو اور کسی بھَٹ یا کھوہ میں رہے، اس لیے عیسائی کلیسا میں ولایت کا یہی تصوّر مقبول ہو گیا اور ایسے ہی لوگوں کی کرامتوں کے قصّوں سے عیسائیوں کے ہاں تذکرۃ الاولیاء قسم کی کتابیں لبریز ہو گئیں۔

تیسرے یہ کہ عیسائیوں کے پاس دین کی سرحدیں متعین کرنے کے لیے کوئی مفصّل شریعت اور کوئی واضح سنّت موجود نہ تھی۔ شریعتِ موسوی کو وہ چھوڑ چکے تھے، اور تنہا انجیل کے اندر کوئی مکمل ہدایت نامہ نہ پایا جاتا تھا۔ اس لیے مسیحی علما کچھ باہر کے فلسفوں اور طور طریقوں سے مُتأثّر ہو کر اور کچھ خود اپنے رُجحانات کی بنا پر طرح طرح کی بدعتیں دین میں داخل کرتے چلے گئے۔ رہبانیت بھی انھی بدعتوں میں سے ایک تھی۔ مسیحی مذہب کے علما اور ائمّہ نے اُس کا فلسفہ اور اُس کا طریقِ کار بدھ مذہب کے بھِکشوؤں سے، ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں سے، قدیم مصری فقرا (anchorites) سے، ایران کے مانویّوں سے، اور افلاطون اور فلاطینوس کے پیرو اِشراقیوں سے اخذ کیا اور اسی کو تزکیۂ نفس کا طریقہ، روحانی ترقی کا ذریعہ، اور تقرّب الی اللہ کا وسیلہ قرار دے لیا۔ اِس غلطی کے مرتکب کوئی معمولی درجے کے لوگ نہ تھے۔ تیسری صدی سے ساتویں صدی عیسوی (یعنی نُزُولِ قرآن کے زمانے) تک جو لوگ مشرق اور مغرب میں مسیحیّت کے اکابر علما، بزرگ ترین پیشوا اور امام مانے جاتے ہیں، سینٹ اَتھاناسیوس، سینٹ باسِل، سینٹ گریگوری نازیانزین، سینٹ کرائی سُوسٹَم، سینٹ اَیمبروز، سینٹ جیرُوم، سینٹ آگسٹائن، سینٹ بینیڈکٹ، گریگوری اعظم، سب کے سب خود راہب اور رہبانیت کے زبردست عَلَم بردار تھے۔ انھی کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔

QuranUrdu.com

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں رہبانیت کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کا بانی سینٹ اَینتھنی (St.Anthony) تھا جو ۲۵۰ء میں پیدا ہوا اور ۳۵۰ء میں دنیا سے رخصت ہوا۔ اسے پہلا مسیحی راہب قرار دیا جاتا ہے۔ اس نے فَیُّوم کے علاقے میں پَسپیر کے مقام پر (جو اَب دَیر المیمون کے نام سے معروف ہے) پہلی خانقاہ قائم کی۔ اس کے بعد دوسری خانقاہ اس نے بحرِ احمر کے ساحل پر قائم کی، جسے اب دَیر مار اَنطُونیُوس کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں میں رہبانیت کے بنیادی قواعد اُسی کی تحریروں اور ہدایات سے ماخوذ ہیں۔ اِس آغاز کے بعد یہ سلسلہ مصر میں سیلاب کی طرح پھیل گیا اور جگہ جگہ راہبوں اور راہبات کے لیے خانقاہیں قائم ہوگئیں، جن میں سے بعض میں تین تین ہزار راہب بیک وقت رہتے تھے۔ ۳۲۵ء میں مصر ہی کے اندر ایک اور مسیحی ولی پاخومیُوس نمودار ہُوا، جس نے دس بڑی خانقاہیں راہبین و راہبات کے لیے بنائیں۔ اِس کے بعد یہ سلسلہ شام و فلسطین اور افریقا و یورپ کے مختلف ملکوں میں پھیلتا چلا گیا۔ کلیسائی نظام کو اوّل اوّل اِس رہبانیّت کے معاملے میں سخت اُلجھن سے سابقہ پیش آیا، کیونکہ وہ ترکِ دنیا اور تجرّد اور غریبی و مفلسی کو روحانی زندگی کا آئیڈیل تو سمجھتا تھا، مگر راہبوں کی طرح شادی بیاہ اور اولاد پیدا کرنے اور مِلکیّت رکھنے کو گناہ بھی نہ ٹھیرا سکتا تھا۔ بالآخر سینٹ اَتھاناسیُوس (مُتوفّٰی ۳۷۳ء)، سینٹ باسِل (مُتوفّٰی ۳۷۹ء)، سینٹ آگسٹائن (مُتوفّٰی ۴۳۰ء) اور گریگوری اعظم (مُتوفّٰی ۶۰۹ء) جیسے لوگوں کے اثر سے رہبانیت کے بہت سے قواعد چرچ کے نظام میں باقاعدہ داخل ہو گئے۔

اِس راہبانہ بدعت کی چند خصوصیات تھیں جنھیں ہم اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

(۱) سخت ریاضتوں اور نت نئے طریقوں سے اپنے جسم کو اذّیتیں دینا۔ اس معاملے میں ہر راہب دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ عیسائی اولیا کے تذکروں میں اِن لوگوں کے جو کمالات بیان کیے گئے ہیں، وہ کچھ اس قسم کے ہیں: اسکندریہ کا سینٹ مَکاریُوس ہر وقت اپنے جسم پر ۸۰ پونڈ کا بوجھ اٹھائے رکھتا تھا۔ ۶ مہینے تک وہ ایک دلدل میں سوتا رہا اور زہریلی مکھیاں اس کے بَرَہنہ جسم کو کاٹتی رہیں۔ اس کے مرید سینٹ یُوسیِبیُوس نے پیر سے بھی بڑھ کر ریاضت کی۔ وہ ۱۵۰ پونڈ کا بوجھ اُٹھائے پھرتا تھا اور ۳ سال تک ایک خشک کنویں میں پڑا رہا۔ سینٹ سابیُوس صرف وہ مکئی کھاتا تھا جو مہینا بھر پانی میں بھیگ کر بدبُودار ہو جاتی تھی۔ سینٹ بَیساریون ۴۰ دن تک خار دار جھاڑیوں میں پڑا رہا اور ۴۰ سال تک اس نے زمین کو پیٹھ نہیں لگائی۔ سینٹ پاخُومیوس نے ۱۵ سال، اور ایک رِوایت کے مطابق ۵۰ سال زمین کو پیٹھ لگائے بغیر گزار دیے۔ ایک ولی سینٹ جان تین سال تک عبادت میں کھڑا رہا۔ اس پُوری مدّت میں وہ نہ کبھی بیٹھا نہ لیٹا۔ آرام کے لیے بس ایک چٹان کا سہارا لے لیتا تھا اور اس کی غذا صرف وہ تبرّک تھا جو ہر اتوار کو اس کے لیے لایا جاتا تھا۔ سینٹ سَیمیُون اِسٹائلائٹ (۳۹۰ء۔ ۴۴۹ء) جو عیسائیوں کے اولیائے کبار میں شمار ہوتا ہے، ہر ایسٹر سے پہلے پُورے چالیس دن فاقہ کرتا تھا۔ ایک دفعہ وہ پُورے ایک سال تک ایک ٹانگ پر کھڑا رہا۔ بسا اوقات وہ اپنی خانقاہ سے نکل کر ایک کنویں میں جا رہتا تھا۔ آخر کار اُس نے شمالی شام کے قَلعَۂ سیمان کے قریب ۶۰ فٹ بلند ایک ستون بنوایا جس کا بالائی حصّہ صرف تین فُٹ کے گھیر میں تھا اور اُوپر کٹہرا بنا دیا گیا تھا۔ اِس ستون پر اس نے پُورے تیس سال گزار دیے۔ دھوپ، بارش،

QuranUrdu.com

سردی، گرمی سب اُس پر گزرتی رہتی تھیں اور وہ کبھی ستون سے نہ اُترتا تھا۔ اس کے مُرید سیڑھی لگا کر اس کو کھانا پہنچاتے اور اس کی گندگی صاف کرتے تھے۔ پھر اس نے ایک رسّی لے کر اپنے آپ کو اس ستون سے باندھ لیا، یہاں تک کہ رسّی اس کے گوشت میں پیوست ہوگئی، گوشت سڑ گیا اور اس میں کیڑے پڑ گئے۔ جب کوئی کیڑا اس کے پھوڑوں سے گر جاتا تو وہ اسے اُٹھا کر پھر پھوڑے ہی میں رکھ لیتا اور کہتا: ''کھا جو کچھ خدا نے تجھے دیا ہے۔'' مسیحی عوام دُور دُور سے اس کی زیارت کے لیے آتے تھے۔ جب وہ مرا تو مسیحی عوام کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ عیسائی ولی کی بہترین مثال تھا۔

اس دَور کے عیسائی اولیا کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں، وہ ایسی ہی مثالوں سے بھری پڑی ہیں۔ کسی ولی کی تعریف یہ تھی کہ ۳۰ سال تک وہ بالکل خاموش رہا اور کبھی اسے بولتے نہ دیکھا گیا۔ کسی نے اپنے آپ کو ایک چٹان سے باندھ رکھا تھا۔ کوئی جنگلوں میں مارا مارا پھرتا اور گھاس پھوس کھا کر گزارا کرتا۔ کوئی بھاری بوجھ ہر وقت اُٹھائے پھرتا۔ کوئی طوق و سلاسل سے اپنے اعضا جکڑے رکھتا۔ کچھ حضرات جانوروں کے بھٹّوں، یا خشک کنوؤں، یا پُرانی قبروں میں رہتے تھے۔ اور کچھ دوسرے بزرگ ہر وقت ننگے رہتے اور اپنا ستر اپنے لمبے لمبے بالوں سے چھپاتے اور زمین پر رینگ کر چلتے تھے۔ ایسے ہی ولیوں کی کرامات کے چرچے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان کے مرنے کے بعد ان کی ہڈیاں خانقاہوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔ مَیں نے خود کوہِ سینا کے نیچے سینٹ کیتھرائن کی خانقاہ میں ایسی ہی ہڈیوں کی ایک پُوری لائبریری سجی ہوئی دیکھی ہے جس میں کہیں اولیا کی کھوپڑیاں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں، کہیں پاؤں کی ہڈیاں، اور کہیں ہاتھوں کی ہڈیاں۔ اور ایک ولی کا تو پُورا ڈھانچا ہی شیشے کی ایک الماری میں رکھا ہوا تھا۔

(۲) ان کی دوسری خصوصیّت یہ تھی کہ وہ ہر وقت گندے رہتے اور صفائی سے سخت پرہیز کرتے تھے۔ نہانا یا جسم کو پانی لگانا ان کے نزدیک خدا پرستی کے خلاف تھا۔ جسم کی صفائی کو وہ روح کی نجاست سمجھتے تھے۔ سینٹ اَتھاناسیوس بڑی عقیدت کے ساتھ سینٹ اَینٹُھنی کی یہ خوبی بیان کرتا ہے کہ اس نے مرتے دم تک کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے۔ سینٹ ابراہام جب سے داخلِ مسیحیّت ہوا، پُورے ۵۰ سال اس نے نہ منہ دھویا نہ پاؤں۔ ایک مشہور راہبہ کنواری سِلوِیا نے عمر بھر اپنی انگلیوں کے سوا جسم کے کسی حصّے کو پانی نہیں لگنے دیا۔ ایک کانونیٹ کی ۱۳۰ راہبات کی تعریف میں لکھا ہے کہ انھوں نے کبھی اپنے پاؤں نہیں دھوئے، اور غسل کا تو نام سن کر ہی ان کے بدن پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

(۳) اِس رہبانیت نے اِزدِواجی زندگی کو عملاً بالکل حرام کر دیا اور نکاح کے رشتے کو کاٹ پھینکنے میں سخت بے دردی سے کام لیا۔ چوتھی اور پانچویں صدی کی تمام مذہبی تحریریں اس خیال سے بھری ہوئی ہیں کہ تجرُّد سب سے بڑی اَخلاقی قدر ہے، اور عِفّت کے معنٰی یہ ہیں کہ آدمی جنسی تعلق سے قطعی احتراز کرے، خواہ وہ میاں اور بیوی کا تعلق ہی کیوں نہ ہو۔ پاکیزہ روحانی زندگی کا کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ آدمی اپنے نفس کو بالکل مار دے اور اس میں جسمانی لذّت کی کوئی خواہش تک باقی نہ چھوڑے۔ ان لوگوں کے نزدیک خواہش کو مار دینا اس لیے ضروری تھا کہ اُس سے حیوانیت کو تقویت پہنچتی ہے۔ ان کے نزدیک لذت اور گناہ ہم معنٰی تھے، حتّٰی کہ مَسَرّت بھی ان کی نگاہ میں خدا فراموشی کی مترادف تھی۔ سینٹ باسِل ہنسنے اور مسکرانے تک کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ انھی تصوّرات کی بنا پر عورت اور مرد کے درمیان شادی کا تعلق ان کے ہاں قطعی نجس قرار پا گیا تھا۔

QuranUrdu.com

راہب کے لیے ضروری تھا کہ وہ شادی کرنا تو درکنار، عورت کی شکل تک نہ دیکھے، اور اگر شادی شدہ ہو تو بیوی کو چھوڑ کر نکل جائے۔ مَردوں کی طرح عورتوں کے دل میں بھی یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ وہ اگر آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا چاہتی ہیں تو ہمیشہ کنواری رہیں، اور شادی شدہ ہوں تو اپنے شوہروں سے الگ ہو جائیں۔ سینٹ جیرُوم جیسا ممتاز مسیحی عالم کہتا ہے کہ ''جو عورت مسیحؑ کی خاطر راہبہ بن کر ساری عمر کنواری رہے، وہ مسیحؑ کی دُلھن ہے اور اُس عورت کی ماں کو خدا، یعنی مسیحؑ کی ساس(mother in law of God) ہونے کا شرف حاصل ہے۔'' ایک اور مقام پر سینٹ جیرُوم کہتا ہے کہ ''عِفّت کی کلھاڑی سے اِزدِواجی تعلق کی لکڑی کو کاٹ پھینکنا سالک کا اوّلین کام ہے۔'' ان تعلیمات کی وجہ سے مذہبی جذبہ طاری ہونے کے بعد ایک مسیحی مرد یا ایک مسیحی عورت پر اُس کا پہلا اثر یہ ہوتا تھا کہ اس کی خوش گوار اِزدِواجی زندگی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتی تھی۔ اور چونکہ مسیحیّت میں طلاق وتفریق کا راستہ بند تھا، اس لیے نکاح کے رشتے میں رہتے ہوئے میاں اور بیوی ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے تھے۔ سینٹ نائلس(St. Nilus) دو بچّوں کا باپ تھا۔ جب اس پر رہبانیّت کا دَورہ پڑا تو اس کی بیوی روتی رہ گئی اور وہ اس سے الگ ہو گیا۔ سینٹ اَمّون (St. Ammon) نے شادی کی پہلی رات ہی اپنی دُلھن کو اِزدِواجی تعلق کی نجاست پر وعظ سنایا اور دونوں نے بالاتفاق طے کر لیا کہ جیتے جی ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ سینٹ ابراہام شادی کی پہلی رات ہی اپنی بیوی کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ یہی حرکت سینٹ ایلیکسِس (St.Alekces) نے کی۔ اس طرح کے واقعات سے عیسائی اولیا کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

کلیسا کا نظام تین صدیوں تک اپنے حُدود میں اِن انتہا پسندانہ تصوّرات کی کسی نہ کسی طرح مزاحمت کرتا رہا۔ اُس زمانے میں ایک پادری کے لیے مجرّد ہونا لازم نہ تھا۔ اگر اُس نے پادری کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے شادی کر رکھی ہو تو وہ بیوی کے ساتھ رہ سکتا تھا، البتہ تقرر کے بعد شادی کرنا اس کے لیے ممنوع تھا۔ نیز کسی ایسے شخص کو پادری مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا جس نے کسی بیوہ یا مُطَلَّقہ سے شادی کی ہو، یا جس کی دو بیویاں ہوں، یا جس کے گھر میں لونڈی ہو۔ رفتہ رفتہ چوتھی صدی میں یہ خیال پُوری طرح زور پکڑ گیا کہ جو شخص کلیسا میں مذہبی خدمات انجام دیتا ہو، اس کے لیے شادی شدہ ہونا بڑی گھناؤنی بات ہے۔ ۳۶۲ء کی گنگرا کونسل(Council of Gengra) آخری مجلس تھی جس میں اِس طرح کے خیالات کو خلافِ مذہب ٹھیرایا گیا۔ مگر اس کے تھوڑی ہی مدّت بعد ۳۸۶ء کی رومن سینا ڈ(Synod) نے تمام پادریوں کو مشورہ دیا کہ وہ اِزدِواجی تعلقات سے کنارہ کش رہیں، اور دوسرے سال پوپ سائریکیس (Siricius) نے حکم دے دیا کہ جو پادری شادی کرے، یا شادی شدہ ہونے کی صورت میں اپنی بیوی سے تعلق رکھے، اُس کو منصب سے معزول کر دیا جائے۔ سینٹ جیرُوم، سینٹ ایمبروز اور سینٹ آگسٹائن جیسے اکابر علما نے بڑے زور شور سے اس فیصلے کی حمایت کی، اور تھوڑی سی مزاحمت کے بعد مغربی کلیسا میں یہ پُوری شدّت کے ساتھ نافذ ہو گیا۔ اس دَور میں متعدّد کونسلیں اِن شکایات پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوئیں کہ جو لوگ پہلے سے شادی شُدہ تھے، وہ مذہبی خدمات پر مقرر ہونے کے بعد بھی اپنی بیویوں کے ساتھ ''ناجائز'' تعلقات رکھتے ہیں۔ آخر کار ان کی اصلاح کے لیے یہ قواعد بنائے گئے کہ وہ کھلے مقامات پر سوئیں، اپنی بیویوں سے کبھی علیحدگی میں نہ ملیں، اور اُن کی ملاقات کے وقت کم از کم دو آدمی موجود ہوں۔

QuranUrdu.com

سینٹ گریگوری ایک پادری کی تعریف میں لکھتا ہے کہ ۴۰ سال تک وہ اپنی بیوی سے الگ رہا، حتّٰی کہ مرتے وقت جب اس کی بیوی اس کے قریب گئی تو اس نے کہا: ”عورت! دُور ہٹ جا!“

(۴) سب سے زیادہ دردناک باب اِس رہبانیت کا یہ ہے کہ اس نے ماں باپ، بھائی بہنوں اور اولاد تک سے آدمی کا رشتہ کاٹ دیا۔ مسیحی ولیوں کی نگاہ میں بیٹے کے لیے ماں باپ کی مَحبّت، بھائی کے لیے بھائی بہنوں کی مَحبّت، اور باپ کے لیے اولاد کی مَحبّت بھی ایک گناہ تھی۔ ان کے نزدیک روحانی ترقی کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ آدمی اِن سارے تعلقات کو توڑ دے۔ مسیحی اولیا کے تذکروں میں اس کے ایسے ایسے دل دوز واقعات ملتے ہیں جنھیں پڑھ کر انسان کے لیے ضبط کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایک راہب ایواگرئیس (Evagrius) سالہا سال سے صحرا میں ریاضتیں کر رہا تھا۔ ایک روز یکایک اس کے پاس اس کی ماں اور اس کے باپ کے خطوط پہنچے جو برسوں سے اس کی جدائی میں تڑپ رہے تھے۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اِن خطوں کو پڑھ کر اس کے دل میں انسانی مَحبّت کے جذبات نہ جاگ اُٹھیں۔ اس نے ان کو کھولے بغیر فوراً آگ میں جھونک دیا۔ سینٹ تھیوڈورس کی ماں اور بہن بہت سے پادریوں کے سِفارشی خُطوط لے کر اُس خانقاہ میں پہنچیں جس میں وہ مقیم تھا اور خواہش کی کہ وہ صرف ایک نظر بیٹے اور بھائی کو دیکھ لیں۔ مگر اس نے ان کے سامنے آنے تک سے انکار کر دیا۔ سینٹ مارکُس (St. Marcus) کی ماں اس سے ملنے کے لیے اُس کی خانقاہ میں گئی اور خانقاہ کے شیخ (Abbot) کی خوشامدیں کر کے اس کو راضی کیا کہ وہ بیٹے کو ماں کے سامنے آنے کا حکم دے۔ مگر بیٹا کسی طرح ماں سے نہ ملنا چاہتا تھا۔ آخرکار اس نے شیخ کے حکم کی تعمیل اس طرح کی کہ بھیس بدل کر ماں کے سامنے گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس طرح نہ ماں نے بیٹے کو پہچانا، نہ بیٹے نے ماں کی شکل دیکھی۔ ایک اور ولی سینٹ پوئمن (St. Poemen) اور اس کے ۶ بھائی مصر کی ایک صحرائی خانقاہ میں رہتے تھے۔ برسوں بعد ان کی بوڑھی ماں کو ان کا پتا معلوم ہوا اور وہ ان سے ملنے کے لیے وہاں پہنچی۔ بیٹے ماں کو دُور سے دیکھتے ہی بھاگ کر اپنے حُجرے میں چلے گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ ماں باہر بیٹھ کر رونے لگی اور اس نے چیخ چیخ کر کہا: ”میں اِس بڑھاپے میں اتنی دُور چل کر صرف تمھیں دیکھنے آئی ہوں، تمھارا کیا نقصان ہوگا اگر میں تمھاری شکلیں دیکھ لوں۔ کیا میں تمھاری ماں نہیں ہوں؟“ مگر ان ولیوں نے دروازہ نہ کھولا اور ماں سے کہہ دیا کہ ہم تجھ سے خدا کے ہاں ملیں گے۔ اس سے بھی زیادہ دردناک قصّہ سینٹ سیمیون اِسٹائلائٹس (St. Simeon Stylites) کا ہے جو ماں باپ کو چھوڑ کر ۲۷ سال غائب رہا۔ باپ اس کے غم میں مر گیا۔ ماں زندہ تھی۔ بیٹے کی ولایت کے چرچے جب دُور ونزدیک پھیل گئے تو اُس کو پتا چلا کہ وہ کہاں ہے۔ بے چاری اس سے ملنے کے لیے اس کی خانقاہ پر پہنچی۔ مگر وہاں کسی عورت کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ اس نے لاکھ منت سماجت کی کہ ”بیٹا! یا تو اُسے اندر بلا لے یا باہر نکل کر اسے اپنی صورت دکھا دے۔“ مگر اس ”ولی اللہ“ نے صاف انکار کر دیا۔ تین رات اور تین دن وہ خانقاہ کے دروازے پر پڑی رہی اور آخرکار وہیں لیٹ کر اس نے جان دے دی۔ تب ولی صاحب نکل کر آئے، ماں کی لاش پر آنسو بہائے اور اس کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ایسی ہی بے دردی ان ولیوں نے بہنوں کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ برتی۔ ایک شخص میوٹیس (Mutius) کا قصہ لکھا ہے کہ وہ خوشحال آدمی تھا۔ یکایک اس پر مذہبی جذبہ طاری ہوا اور وہ اپنے ۸ سال کے اِکلوتے بیٹے کو لے کر

QuranUrdu.com

ایک خانقاہ میں جا پہنچا۔ وہاں اس کی روحانی ترقی کے لیے ضروری تھا کہ وہ بیٹے کی محبّت دل سے نکال دے۔ اس لیے پہلے تو بیٹے کو اُس سے جُدا کر دیا گیا۔ پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک مدت تک طرح طرح کی سختیاں اُس معصوم بچے پر کی جاتی رہیں اور وہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر خانقاہ کے شیخ نے اسے حکم دیا کہ اسے لے جا کر اپنے ہاتھ سے دریا میں پھینک دے۔ جب وہ اس حکم کی تعمیل کے لیے بھی تیار ہو گیا تو عین اُس وقت راہبوں نے بچّے کی جان بچائی جب وہ اسے دریا میں پھینکنے لگا تھا۔ اس کے بعد تسلیم کر لیا گیا کہ وہ واقعی مرتبۂ ولایت کو پہنچ گیا ہے۔

مسیحی رہبانیت کا نقطۂ نظر ان معاملات میں یہ تھا کہ جو شخص خدا کی محبّت چاہتا ہو، اسے انسانی محبّت کی وہ ساری زنجیریں کاٹ دینی چاہییں جو دنیا میں اس کو اپنے والدین، بھائی بہنوں اور بال بچّوں کے ساتھ باندھتی ہیں۔ سینٹ جیرُوم کہتا ہے کہ ''اگرچہ تیرا بھتیجا تیرے گلے میں بانہیں ڈال کر تجھ سے لپٹے، اگرچہ تیری ماں اپنے دودھ کا واسطہ دے کر تجھے روکے، اگرچہ تیرا باپ تجھے روکنے کے لیے تیرے آگے لیٹ جائے، پھر بھی تو سب کو چھوڑ کر اور باپ کے جسم کو روند کر ایک آنسو بہائے بغیر صلیب کے جھنڈے کی طرف دوڑ جا۔ اس معاملے میں بے رحمی ہی تقویٰ ہے۔'' سینٹ گریگوری لکھتا ہے کہ ''ایک نوجوان راہب ماں باپ کی محبّت دل سے نہ نکال سکا اور ایک رات چُپکے سے بھاگ کر اُن سے مل آیا۔ خدا نے اس قصور کی سزا اُسے یہ دی کہ خانقاہ واپس پہنچتے ہی وہ مر گیا۔ اس کی لاش زمین میں دفن کی گئی تو زمین نے اسے قبول نہ کیا۔ بار بار قبر میں ڈالا جاتا اور زمین اسے نکال کر پھینک دیتی۔ آخر کار سینٹ بینیڈکٹ نے اُس کے سینے پر تبرک رکھا، تب قبر نے اسے قبول کیا۔'' ایک راہبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مرنے کے بعد تین دن عذاب میں اس لیے مبتلا رہی کہ وہ اپنی ماں کی محبّت دل سے نہ نکال سکی تھی۔ ایک ولی کی تعریف میں لکھا ہے کہ اس نے کبھی اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی کے ساتھ بے دردی نہیں برتی۔

(۵) اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے ساتھ بے رحمی، سنگدلی اور قساوت برتنے کی جو مشق یہ لوگ کرتے تھے، اس کی وجہ سے ان کے انسانی جذبات مرجاتے تھے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں سے انھیں مذہبی اختلاف ہوتا تھا، ان کے مقابلے میں یہ ظلم وستم کی انتہا کر دیتے تھے۔ چوتھی صدی تک پہنچتے پہنچتے مسیحیّت میں ۸۰-۹۰ فرقے پیدا ہو چکے تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے اپنے زمانے میں ۸۸ فرقے گنائے ہیں۔ یہ فرقے ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت رکھتے تھے۔ اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے والے بھی راہب ہی تھے، اور اس آگ میں مخالف گروہوں کو جلا کر خاک کر دینے کی کوششوں میں بھی راہب ہی پیش پیش ہوتے تھے۔ اسکندریہ اِس فرقہ وارانہ کشمکش کا ایک بڑا اکھاڑا تھا۔ وہاں پہلے ایریَن (Arian) فرقے کے بِشَپ نے اَتھاناسیُوس کی پارٹی پر حملہ کیا، اس کی خانقاہوں سے کنواری راہبات پکڑ پکڑ کر نکالی گئیں، ان کو ننگا کر کے خار دار شاخوں سے پیٹا گیا اور ان کے جسم پر داغ لگائے گئے، تاکہ وہ اپنے عقیدے سے توبہ کریں۔ پھر جب مصر میں کیتھولک گروہ کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے ایریَن فرقے کے خلاف یہی سب کچھ کیا، حتّٰی کہ غالب خیال یہ ہے کہ خود ایریُس (Arius) کو بھی زہر دے کر مار دیا گیا۔ اسی اسکندریہ میں ایک مرتبہ سینٹ سائرِل (St.Cyril) کے مرید راہبوں نے ہنگامۂ عظیم برپا کیا، یہاں تک کہ مخالف فرقے کی ایک راہبہ کو پکڑ کر اپنے کلیسا میں لے گئے، اسے قتل کیا، اس کی لاش کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالی اور پھر اسے آگ میں جھونک دیا۔ روم کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ تھا۔ ۳۶۶ء میں پوپ لِبیرِیس (Liberius) کی

QuranUrdu.com

وفات پر دو گروہوں نے پاپائی کے لیے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کیے۔ دونوں کے درمیان سخت خون ریزی ہوئی۔ حتّٰی کہ ایک دن میں صرف ایک چرچ سے ۱۳۷ لاشیں نکالی گئیں۔

(۶) اس ترک و تجرید اور فقر و درویشی کے ساتھ دولتِ دنیا سمیٹنے میں بھی کمی نہ کی گئی۔ پانچویں صدی کے آغاز ہی میں حالت یہ ہو چکی تھی کہ روم کا بِشَپ بادشاہوں کی طرح اپنے محل میں رہتا تھا اور اس کی سواری جب شہر میں نکلتی تھی تو اس کے ٹھاٹ باٹ قیصر کی سواری سے کم نہ ہوتے تھے۔ سینٹ جیرُوم اپنے زمانے (چوتھی صدی کے آخری دَور) میں شکایت کرتا ہے کہ بہت سے بِشَپوں کی دعوتیں اپنی شان میں گورنروں کی دعوتوں کو شرماتی ہیں۔ خانقاہوں اور کنیسوں کی طرف دولت کا یہ بہاؤ ساتویں صدی (نُزولِ قرآن کے زمانے) تک پہنچتے پہنچتے سیلاب کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ یہ بات عوام کے ذہن نشین کرا دی گئی تھی کہ جس کسی سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو جائے، اس کی بخشش کسی نہ کسی ولی کی درگاہ پر نذرانہ چڑھانے، یا کسی خانقاہ یا چرچ کو بھینٹ دینے ہی سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد وہی دنیا راہبوں کے قدموں میں آ رہی جس سے فرار اُن کا طُرّہ امتیاز تھا۔ خاص طور پر جو چیز اس تنزل کی مُوجِب ہوئی، وہ یہ تھی کہ راہبوں کی غیر معمولی ریاضتیں اور ان کی نفس کُشی کے کمالات دیکھ کر جب عوام میں ان کے لیے بے پناہ عقیدت پیدا ہو گئی، تو بہت سے دنیا پرست لوگ لباسِ درویشی پہن کر راہبوں کے گروہ میں داخل ہو گئے، اور انھوں نے ترکِ دنیا کے بھیس میں جلبِ دنیا کا کاروبار ایسا چمکایا کہ بڑے بڑے طالبینِ دنیا اُن سے مات کھا گئے۔

(۷) عِفّت کے معاملے میں بھی فطرت سے لڑ کر رہبانیت نے بارہا شکست کھائی، اور جب شکست کھائی تو بُری طرح کھائی۔ خانقاہوں میں نفس کُشی کی کچھ مشقیں ایسی بھی تھیں جن میں راہب اور راہبات مل کر ایک ہی جگہ رہتے تھے، اور بسا اوقات ذرا زیادہ مشق کرنے کے لیے ایک ہی بستر پر رات گزارتے تھے۔ مشہور راہب سینٹ اِیوا گریَس (St. Evagrius) بڑی تعریف کے ساتھ فلسطین کے اُن راہبوں کے ضبطِ نفس کا ذکر کرتا ہے جو "اپنے جذبات پر اتنا قابو پا گئے تھے کہ عورتوں کے ساتھ یک جا غسل کرتے تھے، اور اُن کی دِید سے، ان کے لَمس سے، حتّٰی کہ ان کے ساتھ ہم آغوشی سے بھی ان کے اُوپر فطرت غلبہ نہ پاتی تھی۔" غسل اگرچہ رہبانیت میں سخت ناپسندیدہ تھا، مگر نفس کُشی کی مشق کے لیے اِس طرح کے غسل بھی کر لیے جاتے تھے۔ آخر کار اسی فلسطین کے متعلق نیسا (Nyssa) کا سینٹ گریگوری (مُتَوَفّٰی ۳۹۶ء) لکھتا ہے کہ وہ بدکرداری کا اڈّا بن گیا ہے۔ انسانی فطرت کبھی اُن لوگوں سے انتقام لیے بغیر نہیں رہتی جو اُس سے جنگ کریں۔ رہبانیت اُس سے لڑ کر بالآخر بداَخلاقی کے جس گڑھے میں جا گری، اس کی داستان آٹھویں صدی سے گیارھویں صدی عیسوی تک کی مذہبی تاریخ کا بدنُما ترین داغ ہے۔ دسویں صدی کا ایک اطالوی بِشَپ لکھتا ہے کہ "اگر چرچ میں مذہبی خدمات انجام دینے والوں کے خلاف بدچلنی کی سزائیں نافذ کرنے کا قانون عملاً جاری کر دیا جائے تو لڑکوں کے سوا کوئی سزا سے نہ بچ سکے گا، اور اگر حرامی بچوں کو بھی مذہبی خدمات سے الگ کر دینے کا قاعدہ نافذ کیا جائے تو شاید چرچ کے خادموں میں کوئی لڑکا تک باقی نہ رہے۔" قُرونِ مُتَوَسِّطہ کے مصنّفین کی کتابیں اِن شکایتوں سے بھری ہوئی ہیں کہ راہبات کی خانقاہیں بداَخلاقی کے چکلے بن گئی ہیں، اُن کی چار دیواریوں میں نوزائیدہ بچوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے، پادریوں اور چرچ کے مذہبی کارکنوں میں مُحرّمات تک سے ناجائز تعلقات اور خانقاہوں میں خلافِ وضعِ فطری

QuranUrdu.com

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ،[۵۵] اللہ تمھیں اپنی رحمت کا دُہرا حصّہ عطا فرمائے گا اور تمھیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے،[۵۶]

جرائم تک پھیل گئے ہیں، اور کلیساؤں میں اعترافِ گناہ (confession) کی رسم بدکرداری کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان تفصیلات سے صحیح طور پر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید یہاں رہبانیت کی بدعت ایجاد کرنے اور پھر اس کا حق ادا نہ کرنے کا ذکر کر کے مسیحیت کے کس بگاڑ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

۵۵ – اس آیت کی تفسیر میں مفسّرین کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ یہاں یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب اُن لوگوں سے ہے جو حضرت عیسٰیؑ پر ایمان لائے ہوئے تھے۔ اُن سے فرمایا جا رہا ہے کہ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاؤ، تمھیں اِس پر دُہرا اجر ملے گا، ایک اجر ایمان بر عیسٰیؑ کا، اور دوسرا اجر ایمان بر محمدؐ کا۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ خطاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں سے ہے۔ اُن سے ارشاد ہو رہا ہے کہ تم محض زبان سے آپؐ کی نبوت کا اقرار کر کے نہ رہ جاؤ، بلکہ صدقِ دل سے ایمان لاؤ اور ایمان لانے کا حق ادا کرو۔ اِس پر تمھیں دُہرا اجر ملے گا۔ ایک اجر کفر سے اسلام کی طرف آنے کا، اور دوسرا اجر اسلام میں اخلاص اختیار کرنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کا۔ پہلی تفسیر کی تائید سورۂ قصص کی آیات ۵۲ تا ۵۴ کرتی ہیں، اور مزید برآں اس کی تائید حضرت ابو موسیٰ اَشعریؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تین آدمی ہیں جن کے لیے دُہرا اجر ہے۔ ان میں سے ایک ہے رجُل مّن اهل الکتاب اٰمن بنبیّه واٰمن بمحمّدٍ۔ "اہلِ کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے سابق نبی پر ایمان رکھتا تھا اور پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی ایمان لے آیا" (بخاری و مسلم) دوسری تفسیر کی تائید سورۂ سَبا کی آیت ۳۷ کرتی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ مومنین صالحین کے لیے دوگُنا اجر ہے۔ دلیل کے اعتبار سے دونوں تفسیروں کا وزن مُساوی ہے۔ لیکن آگے کے مضمون پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسری تفسیر ہی اِس مَقام سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، بلکہ درحقیقت اِس سورت کا پورا مضمون از اوّل تا آخر اِسی تفسیر کی تائید کرتا ہے۔ شروع سے اِس سورت کے مخاطَب وہی لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر کے داخلِ اسلام ہوئے تھے، اور پُوری سورت میں انھی کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ محض زبان کے مومن نہ بنیں بلکہ اخلاص کے ساتھ سچّے دل سے ایمان لائیں۔

۵۶ – یعنی دنیا میں علم و بصیرت کا وہ نور عطا فرمائے گا جس کی روشنی میں تم کو قدم قدم پر صاف نظر آتا رہے گا کہ زندگی کے مختلف معاملات میں جاہلیّت کی ٹیڑھی راہوں کے درمیان اسلام کی سیدھی راہ کون سی ہے۔ اور آخرت میں وہ نور بخشے گا جس کا ذکر آیت ۱۲ میں گزر چکا ہے۔

QuranUrdu.com

وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ
الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اَنَّ الْفَضْلَ
بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾ ع

اور تمھارے قصور معاف کر دے گا،[۵۷] اللہ بڑا معاف کرنے والا اور مہربان ہے۔ (تم کو یہ رَوِش اختیار کرنی چاہیے) تاکہ اہلِ کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل پر اُن کا کوئی اجارہ نہیں ہے، اور یہ کہ اللہ کا فضل اس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہے، جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور وہ بڑے فضل والا ہے۔ ع

۵۷ – یعنی ایمان کے تقاضے پُورے کرنے کی مخلصانہ کوشش کے باوجود بَشَری کمزوریوں کی بنا پر جو قصور بھی تم سے سرزد ہو جائیں ان سے درگزر فرمائے گا، اور وہ قُصور بھی معاف کرے گا جو ایمان لانے سے پہلے جاہلیّت کی حالت میں تم سے سرزد ہوئے تھے۔